

لپ اسٹک

نووار علیگی

کا پیغام UrduRasala.com

درخشاں کو بیبٹ ناک، دہشت ناک اور خوفناک قلمیں دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور کتنا شوق تھا، اسے اتنا ہی ان فلموں کو دیکھ کر ڈر لاتا تھا۔

پاکستان میں تو خیر کوئی مسئلہ نہ تھا، لیکن جب سے وہ امریکا آئی تھی، ان ہو رہے فلموں کا کریز اس کے لیے جان لیوا ہو گیا تھا۔

پاکستان میں اس کی چھوٹی بہن گل افشاں اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ گل افشاں کرکٹ اور فلموں کا کمپیوٹر تھی۔ کرکٹ کا کوئی بھی مسئلہ ہوتا، مثلاً کس کھلاڑی نے کس سن میں پہلی پنجری بنائی تھی۔ کس نیم سے مقابلہ تھا، کس شہر میں تھا۔ اگر اس دن بارش کی وجہ سے میچ نہیں

اس دل کے جملہ نتوق بُجت منتف اور پبلشرز محفوظ ہیں۔ ہم اسے صرف اردو زبان کی ترجمہ کے لیے Online کر رہے ہیں تاکہ دنیا جان کے کار دو زبان میں کتنا غصہ کام ہو لے ہے۔ ہمارا منفرد اس ویب سائٹ کے ذریعے اردو کے گم شدہ خزانے کو ان لوگوں تک پہنچانا ہے جو کسی وجہ سے اس سے محروم رہ گئے۔ خاص طور پر ان بیرون ملک پاکستانیوں کو جو یادِ جود پوری کوشش کے ان داں کو حاصل نہیں کر سکتے۔

اگر آپ کو یہ کتاب پسند آئی ہے اور آپ استثنائی رکھتے ہیں تو مہربانی فرمائی کراس کو خرید کر پڑھنے کے لئے منتف اور پبلشرز کو مالی فائدہ پہنچ سکے۔

یہی، لیکن اتنی بڑی نہ تھی کہ وہ اسے آپ، کہہ کر مخاطب کرتی۔ وہ اسے بڑی بے تکلفی سے ”تو“ کہتی اور وہ اس ”تو“ کو سن کر ناراض نہ

ہوتی۔

”ہائے گل! ڈراؤنی فلمیں دیکھ کر بڑا مزہ آتا ہے۔“ درخشاں کہتی۔

”مزہ آتا ہے تو انہیں دیکھ کر ہونا بھی مزے سے کر جھے کیوں رات بھر پریشان کرتی ہے۔“

”میں کہاں پریشان کرتی ہوں؟ میں تو بڑے آرام سے سو جاتی ہوں۔“ وہ صاف صاف جھوٹ بولتی۔

”ہاں میں کہاں پریشان کرتی ہوں۔“ وہ سفید جھوٹ نہ کر کلبلای اٹھتی۔ ”بھروسہ بچوں کی طرح چھٹ کر کون سوتا ہے۔ کمرے کی لائٹ بجھاتی ہوں تو رو نے بیٹھ جاتی ہے۔ دروازے کھڑ کیاں اندر سے بند

ہوں کا تھا تو یہ اور اس سے متعاقبہ تمام معلومات وہ اس قدر تیزی سے بیان کرتی تھی کہ اس کے حافظے پر حیرت بوتی تھی۔ یہی حال فلموں کا تھا فلمیں چاہئے بھارتی ہوں، پاکستانی ہوں، انگلش ہوں، سب کے بارے میں یکساں معلومات رکھتی تھی۔ کسی بھی اداکارہ کا ذکر ہوتا، وہ اس کے سن ولادت سے لے کر شادیوں، طلاقوں اور بچوں تک کا حال بیان کر دیتی۔ کون سا گانا کس فلم کا ہے۔ یہ بتانا تو اس کے لیے بالکل مشکل نہ ہوتا۔ وہ تو یہ بھی بتا دیتی تھی کہ اس گانے کو کس نے گایا، کس اداکار پر پکھرا نہ ہوا اور اس اداکار نے کیسے اور کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کا مودہ ہوتا تو وہ بیک وقت تین فلمیں دیکھتی اور

مجال ہے کہ ایک فلم کی کہانی، دوسری فلم میں گذشتہ ہو جائے۔ گل انشاں کہتی۔ ”باجی تو الاباق تسم کی فلمیں کیوں دیکھتی ہے؟“ درخشاں گل انشاں سے بڑی تھی، اسی لیے وہ اسے باجی کہتی

ٹی وی لاو نج سے ٹی وی ٹرالی اندر کمرے میں کھینچ لاتی اور اسے بیڈ
کے عین سامنے کر کے خود بیڈ پر بیٹھ جاتی۔ کھڑکیاں پہلے ہی بند ہوتیں،
دروازہ بھی بند کر دیا جاتا۔ درختاں کو یہ سب اہتمام کرتے دیکھ کر گل
افشاں سمجھ جاتی کہ ٹی وی پر اب بیتنا کہ شکلیں ابھر نے والی ہیں۔ وہ
فوراً کمبل اوڑھ کر لیٹ جاتی، لیکن درختاں اسے ایسا کرنے نہ دیتی،
کہتی۔ ”میری پیاری بہن لیٹ مت نہیں تو تو سو جائے گی؛ پھر میں
اکیدے فلم کس طرح دیکھوں گی۔“

نتیجے میں اسے اٹھ کر بیٹھنا پڑتا۔ دونوں بہنوں کو ایک دوسرے
سے محبت بہت تھی۔ جہاں وہ ایک دوسرے سے جھگڑتی رہتی تھیں۔
وہاں ایک دوسرے کا خیال بھی رکھتی تھیں۔ گل افشاں اس کی خوشامد
کرنے پر پیٹھ موز کر بیٹھ جاتی۔

جب فلم شروع ہوتی اور کوئی ڈراؤ نا منظر آتا کسی کی تین سائی دیتی

ہونے کے باوجود ان میں موجود ہر سوراخ میں کپڑے مخونے کی
کوشش کون کرتا ہے؟“

”میں کرتی ہوں، تو دیکھتی نہیں کہ فلموں میں آسیں اسی طرح
اندر داخل ہوتے ہیں۔ اس لیے دروازے کے تالے کے سوراخ
میں کپڑا مخونتا پڑتا ہے۔“ وہ بڑی سادگی سے کہتی۔

”جب تجھے اتنا ڈر لگتا ہے تو ایسی فلم میں دیکھتی کیوں ہے؟“ گل
افشاں اسے ڈانتی۔

”تو تو جیسے بڑی بہادر ہے ڈرتی ہی نہیں۔“

”میں ڈرتی ہوں، میں نے کب کہا کہ نہیں ڈرتی؟“ اسی لیے میں
ڈراؤنی فلم میں نہیں دیکھتی۔“

اور یہ حقیقت تھی جب درختاں وی سی آر پر کوئی ڈراؤنی فلم لگاتی
تو وہ پیٹھ موز کر بیٹھ جاتی۔ رات کو جب درختاں کو فلم دیکھنا ہوتی تو وہ

گل افشاں سے لپٹ جاتی۔

اس ایک فلم دیکھنے کے نتیجے میں کئی دن درختاں کوڈ رکلتا۔ وہ

سو تے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ گل افشاں کو جستجوڑ کر اٹھادیتی اور وہ

بے چاری خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ ”ہاں کیا ہوا؟“

”گل افشاں میری پیاری بہن، مجھ کوڈ رلگ رہا تھا۔ وہ آگی
تھا۔“ درختاں لرزتے ہوئے کہتی۔

”اچھا، اب زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، خاموشی

سے سو جا، میں جاگ رہی ہوں۔“

”میری پیاری بہن، میری طرف منہ کر لے۔“

”لے۔“ گل افشاں غصے میں کہتی۔ ”اب کہے گی، میرے اوپر

باتھر کھلے۔“

”ایسا کرے تو بہت اچھا ہو، مجھے جلد نیندا آجائے گی، میں سو جاؤں

تو گل افشاں درختاں سے پوچھتی۔ ”جابی بتانا کیا ہو رہا ہے؟“

تب درختاں فلم کا آنکھوں دیکھا حال اسے بتانے لگتی۔ قلم میں

اس وقت اگر کوئی ڈراؤ نہ میں شیل رہا ہوتا تو وہ کہتی۔ ”اب دیکھ لے

لاکن کلیئر ہے۔“

تو وہ گردن گھما کر ڈرتے ڈرتے ٹی وی دیکھنے لگتی۔ جیسے ہی کوئی

خوناک منظر آتا تو وہ پھر پیٹھ موز کر بیٹھ جاتی اور درختاں کی کنسٹری

شروع ہو جاتی۔

فلم ختم ہوتی تو ٹی وی ٹرالی کولا دن بھج تک پیچانا اور با تھر روم میں

جانا ایک مسئلہ بن جاتا۔ خیر ٹی وی ٹرالی کو گل افشاں لا دن بھج میں دھکیل

آتی، لیکن وہ اس کے ساتھ با تھر روم تو نہیں جا سکتی تھی۔ درختاں کسی

طرح ہمت کر کے با تھر روم تک جاتی اور اتفاق سے کہی اسے کوئی

لال بیگ ٹبلتا ہو انظر آ جاتا تو وہ تین مار کر با تھر روم سے باہر آ جاتی اور

گی؟ پھر تم بے شک میرے اوپر سے یا تھہ ہٹا لینا، ادھر کروٹ لے ہوتے ہوئے اسے کسی قسم کی پریشانی نہ ہو گی۔

لیں۔" درختاں بڑی مسکینیت سے کہتی۔

کراچی ایئر پورٹ پر جب گل افشاں نے اسے آنسو بھری آنکھوں سے رخصت کیا تو ایک نصیحت کی اور یہ نصیحت ذراً نی فلموں کے بارے میں تھی۔

"خدا کے لیے وہاں اپنے اوپر حتم کرنا، ہور فلمیں بھول کرنا دیکھنا۔"

اس کی مسکین صورت دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اس پر حتم آ جاتا اور وہ غصہ چھوڑ کر اسے پیار سے اپنے تریب کر لیتی۔

"باجی، تم فلمیں دیکھنا مت چھوڑنا" بے شک مر جانا۔ "وہ اس کے بالوں میں انگیاں پھیرتی۔

لیکن درختاں نے نیو یارک پہنچ کر سب سے پہلا کام کیا، وہ ہور ر

درختاں اس بات کا کوئی جواب نہ دیتی۔ تھوڑی دیر میں دونوں کو نیند آ جاتی۔

فلموں سے متعلق معلومات کا تھا۔ گھر میں ویسی آرموجوں کا تھا، لیکن

صحیح کو نہیں تو رات کے خوف کا ان پر کوئی سایہ بھی نہ ہوتا۔

بھیا، بھائی کو فلموں سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ بھائی کو تو بالکل نہ تھا۔ کبھی

درختاں نے ایم ایس آئی کرنے کے بعد امریکا کا رخ کیا۔ نیو یارک میں اس کے بڑے بھائی بابر بلاں موجود تھے۔ لندز ار ہائش کا کوئی

کھار با بر کا کوئی دوست بھارتی فلم کا کیسٹ اٹھا لاتا تو وہ اس فلم کو

مسلسلہ نہ تھا۔ والدین نے بھی یہی سوچ کر اسے پہنچ دیا تھا کہ بابر کے

چلتے پھرتے دیکھ لیا کرتی تھیں۔ بابر کے پاس وقت ہوتا تو وہ انگاش

فلم دیکھ لیتا تھا ورنہ ویسی آرموج پڑا رہتا تھا۔

کے کیست کہاں سے حاصل کرے گی، کیونکہ نیو یارک آئے ہوئے اسے چوبیس گھنٹے سے زائد نہ ہوئے تھے۔ وہ بیان کی کسی دلیل بیو شاپ سے واقع نہ تھی۔

آج بارہ نئے کرچپیس منٹ پر جو فلم آنا تھا، وہ ایک دماغی فلم تھی اور اسے ٹیلی ویژن کے پروگرام بنانے والے ایک کمرشل ادارے نے بنایا تھا۔ فلم کے تعارف سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک دلچسپ اور بے حد ڈراؤنی فلم ہو گی۔

ابھی رات کے نوبجے تھے۔ وہ لوگ کہانے سے فارغ ہو کر کافی کے کپ ہاتھ میں تھائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ پاکستان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ بھیا اور بھائی ایک ایک کے عزیزوں رشتے داروں اور دوستوں کا حال پوچھ رہے تھے۔ بھائی خاندان ہی کی تھیں، اس لیے ان کے اور با بر کے رشتے دار مشترک ہی تھے۔

فلموں کے بارے میں بھیا، بھائی کی عدم دلچسپی سے اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر بھائی ذرا بھی فلموں میں دلچسپی رکھتی ہوں گی تو وہ انہیں کسی نہ کسی طرح ہور فلموں کی طرف راغب کر لے گی۔ اگر وہ ڈراؤنی فلمیں دیکھنے کے لیے راضی نہیں ہوں گی، تب کم از کم وہ انہیں اپنا ماحافظہ تو بنالے گی۔

بیان کا ٹیلی ویژن چوبیس گھنٹے چلتا تھا۔ بہت سے چینل تھے اور ان چینلوں پر مختلف قسم کے پروگرام پیش کیے جاتے تھے۔ اخبار دیکھ کر اس نے ٹی وی پروگراموں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ تب اسے معلوم ہوا کہ ایک دن چھوڑ کر ایک چینل سے رات بارہ بجے کے بعد ڈراؤنی فلمیں ٹیلی کاست کی جاتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

اب اسے وی آر کی ضرورت تھی، نہ مسئلہ تھا کہ ڈراؤنی فلموں

تاسب کا بہت خیال رہتا تھا۔ دوسرے وہ بچے کی پرورش سے بہت گھبراتی تھی۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ یہ معاملہ جس قدر مل سکتا ہے، مل کر ہے۔ اس طرح اس نے ثالثے نالے پانچ سال گزار دیئے تھے، لیکن اب با بر بلال کا اس معاملے میں اصرار بڑھ رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ اب شاید وہ اس سلسلہ نیں مزید چھپوٹ حاصل نہ کر سکے۔ درختان نے آکر اس جلتے ہوئے مسئلے پر اور پڑوں چیڑک دیا۔ اس نے اپنے بھائی سے تو کچھ نہ کہا، وہ ان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک تو بڑے بھائی تھے، پھر وہ ریزو بھی رہتے تھے۔ اس نے بھائی کو پکڑا۔

”کیوں بھائی یہ کیا چکر ہے؟“

”کہاں کیا چکر ہے؟“ فاخرہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہوتا کیوں نہیں؟“ درختان نے چھٹ کی طرف دیکھتے ہوئے

با بر بلال کو امریکہ آئے تقریباً دس گیارہ سال ہو گئے تھے۔ وہ یہاں بہت اچھی طرح سیٹ تھے، ان کے پاس گرین کارڈ موجود تھا۔ وہ یہاں کی ایک بڑی فرم میں جو مختلف کاروبار کرتی تھی، ایک اچھے ہدے پر فائز تھے ان کا دفتر ان کی رہائش گاہ سے خاصے ناصلے پر تھا۔ اس لیے انہیں دفتر وقت پر پہنچنے کے لیے گھر سے صبح ساڑھے سات بجے لکھنا پڑتا تھا۔ اسی طرح واپسی میں بھی انہیں سات آٹھ بجے جاتے تھے۔ اس دوران بھائی گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ با بر بلال کی شادی ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ ان کے ہاں ابھی کسی بچے نے جنم نہ لیا تھا۔

اس سلسلے میں با بر بلال بہت فکر مند تھے، لیکن بھائی فاخرہ ان کی اس فکر کو چنگیاں میں اڑا دیتی تھیں۔ فاخرہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کے یہاں اتنی جلد بچہ ہو۔ وہ ایک فیشن ببل لڑکی تھی، اسے اپنے جسم کے

سب ہو چکے ہوتے اور تم نے بالآخر تنگ آ کر گردن جھکا دی ہوتی۔“

”اگردن جھکا دی ہوتی، کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے میں بھیا کا وہ خط پڑھ چکی ہوں جوانہوں نے امی کو لکھا تھا۔“

”ہے، کیا یہ خالہ جان کو بھی کچھ لکھ چکے ہیں، کیا لکھا تھا، انہوں نے؟“

”یہی کہ فاخرہ ابھی نہیں چاہتی کہ اس کے یہاں بچہ ہو۔“

”بڑے خراب ہیں یہ۔“ فاخرہ نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

”خیر، کوئی بات نہیں، اب تم ادھر آگئے ہیں، ہور ہے گا کچھ نہ کچھ گھبرا دو مت۔“

”اچھا میری ساس، فاخرہ نے نہیں کہا۔“ میں بھی دیکھتی ہوں، کیا ہوتا ہے؟“

”بھی، کیا نہیں ہوتا۔“ وہ کچھ نہ سمجھی۔

”پانچ سال ہو گئے۔“ درختاں بولی۔

”کس بات کو؟“ فاخرہ نے پوچھا۔

”آپ کی شادی کو۔“

”تو پھر؟“ ”صاف کہاوا آئرہ ہی رہیں گی۔“

”ہاں صاف کہو سیلی بھانے کا کیا فائدہ۔“

”بچہ کیوں نہیں ہوتا؟“ آخر درختاں نے صاف کہہ دیا۔

”میری ساس، تجھے اتنی فکر کیوں ہے؟“

”بھائی قسم سے، تم اپنے ملک میں ہوتیں تو اب تک تمہاری مصیبت آگئی ہوتی۔ ای نے اب تک تمہیں دنیا جہاں کے چکر کٹوادیے ہوتے۔ ڈاکڑی سے لے کر جہاڑ پھونک، تعویذ گذے

نے دیکھ دی۔

”سو میں سے کوئی ایک عورت ہوتی ہو گی جو ماں بننے کے بعد مت یہ خوب صورت ہو جاتی ہو گی، مجھے یقین ہے کہ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں۔“ فاخرہ نے وثوق سے کہا۔

”وہ کئی یہ بات بچے کی پرورش کی تو تمہیں کون سالازمت پر جانا ہوتا ہے؟ دن بھر گھر میں رہتی ہو، پھر کیا مشکل ہے۔ اب تو میں کہی یہاں آگئی ہوں، دو تین سال ریسرچ میں لگ ہی جائیں گے۔ میں آپ کا ہاتھ بٹا دیا کروں گی۔ اب تو آپ مان جائیں۔“

”اوہ میرے حسن کا کیا ہو گا؟“ فاخرہ پریشان ہو کر بولی۔

”بگزے گا نہیں، سنورے گا، یہ میری گارتی ہے، اگر بگزے جائے تو پیسے واپس۔“

اسی طرح بحث مبارحتے میں کوئی بارہ نج گئے۔ باہر بلال کب کے

”ویسے بھائی، پانچ سال ہو گئے، تم اگوں پر اتنا ظالم نہ کرو، اب اس گھر میں نہیں نہیں چیخوں کی آواز آنے دو۔“ درختان نے بیٹھے ہوئے کہا۔

”پیکی تو سمجھتی نہیں۔“ فاخرہ بولی۔

”سمجاو گی تو سمجھوں گی نا، بلو، کیا کہنا چاہتی ہو۔“ درختان نے ذرا آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بچہ ہونا تو کوئی مسئلہ نہیں، لیکن بچے کی پرورش کرے گا کون؟ بھائی صاف بات ہے، مجھے سے یہ ذمے داری نہیں اٹھائی جائے گی۔

پھر ایک بات اور ہے بچے کی پیدائش کے بعد عورت میں جان نہیں رہتی، ایک دم کو کھلی ہو جاتی ہے۔ موٹی بھدی اور پلی ہو جاتی ہے۔“

”ساری عورتیں تو نہیں ہو جاتیں، بعض عورتیں ماں بننے کے بعد اور نکھر جاتی ہیں، پر کشش اور خوب صورت ہو جاتی ہیں۔“ درختان

”اچھا! اس وقت بھی میں دیرین پر کوئی فلم آتی ہے؟ یہ تو میں آج ہی سن رہی ہوں، مجھے یہاں رہتے ہوئے پانچ سال ہو گئے میں آج تک یہ یات نہ جان سکی، لیکن تمہیں یہاں آئے ابھی چوبیس گھنٹے ہوئے ہیں، پھر بھی تم نے یہ معلوم کر لیا کہ اس وقت فلم آتی ہے، تمہیں کس نے بتایا؟“

”یہ کون آئی مشکل یات ہے، میں نے اخبار میں پروگرام دیکھا ہے۔ بھائی بات یہ ہے کہ آدمی کا شوق ہوتا سے خدا بھی مل جاتا ہے۔“ درختان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا اخبار سے معلوم ہوا تمہیں! بھائی یہاں اخبار پڑھتا کون ہے۔ یہاں اخیار بھی تو ڈیڑھ سیر ہوتا ہے صفحات اتنے الٹے آدمی تھک جاتا ہے۔ میں تو بس اشتہار کے لیے اخبار دیکھتی ہوں۔“

”ماشاء اللہ آپ بڑا اچھا کرتی ہیں، کچھ دیر بیٹھ جائیں نا، فلم دیکھے آئے گی، اسے دیکھ کر سوؤں گی۔“

سونے جا چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہی درختان نے یہ ساری گفتگو چھیڑی تھی اور بڑی حد تک اس نے فاخرہ کو قاتل کر لیا تھا۔

”ہائے بارہ نج گئے، اب میں چلوں سونے۔“ فاخرہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اب تم بھی سو جاؤ۔“

”بھائی! کیا آپ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سوتی ہیں۔“ درختان نے پوچھا۔

”ہاں کیوں؟“

”ایے ہی پوچھو رہی تھی! میں خود دروازہ بند کرنے کے سوتی ہوں، دروازہ کھلا ہوتا میں سوہنی نہیں سکتی۔“

”ٹھیک ہے تو بند کر لینا۔“ فاخرہ نے کہا۔

”خیر، ابھی تو میں جاگ رہی ہوں، بارہ چھپس پر ٹوٹی پر ایک فلم آئے گی، اسے دیکھ کر سوؤں گی۔“

وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے نہ سو نہیں تاکہ اسے ڈر لگے تو وہ انہیں خاموشی سے اٹھا لے، لیکن یہ بات وہ کچھ شرم اور کچھ جھگ کی بنا پر نہ کہہ سکی کہ بھابی کیا کہیں گی، کیا سوچیں گی۔ ہو سکتا ہے وہ پلت کر کہہ دیں کہ بی بی! اتنا ہی ڈرتی ہو تو پھر فلم دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر انہیں کون قاتل کر یگا۔

فائزہ کے کرا بند کرنے کے بعد اس نے سر کو فیصلہ کن انداز میں جھینکا اور فرالاپنے آپ میں ہمت پیدا کر کے بولی۔ ”دیکھا جائے گا۔“ اس نے اپنے کمرے میں ٹیلی ویرلن گھسیٹا اور اسے کھول کر بید پر بیٹھ گئی۔

کرہی جائیں۔ فلم بھی بڑی مزیدار ہے۔“ درختان نے اس کے شوق..... کو ابھارتے کی کوشش کی۔

”بے حد ڈراموں، آپ نے کبھی یور فلمیں دیکھی ہیں؟“ درختان نے پوچھا۔

”نابا با، مجھے تو تم معاف رکھو، میں دیسی فلمیں نہیں دیکھتی تو یہ خوفناک فلم کیا دیکھوں گی۔ تم دیکھوں میں تو چلی، صحیح مجھے جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔ اچھا شہ بخیر۔“ یہ کہہ کر وہ بیڈروم میں داخل ہوئی اور کھٹاک سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

درختان نے جس مقصد کے لیے یہ بات چھیڑی تھی، وہ دل ہی دل میں رو گئی۔ یہ بات تو درختان کو کراچی سے ہی معلوم تھی کہ بھابی کو فلمیں دیکھنے کا قطعاً شوق ہی نہیں البتہ اس وقت ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ ان سے یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ

ٹھیک بارہ چھیس پر انا د نسر نمودار ہوئی۔

اس نے فلم شروع ہونے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی خصوصی ہدایت بھی کہ اس فلم کو مکروہ دل حضرات ہرگز نہ دیکھیں۔ اور مضبوط دل کے لوگ بھی اسے اکیلے نہ دیکھیں۔ یہ بات سن کر جہاں اس کے ذہن میں سنسنی پیدا ہوئی، وہاں اس نے سوچا کہ خیر وہ مضبوط دل کی تو ہے، پوری فلم دیکھ لے گی، لیکن ہے اکیلی۔ کمرے میں اکیلی ہے تو کیا ہوا، گھر میں بھیا، بھائی تو ہیں۔ اگر بہت ڈر لگے گا تو وہ انہیں جگا لے گی۔ بے شک، بھیا بعد میں ڈراؤنی فلم دیکھنے پر کتنا ہی ڈانشیں۔

فلم شروع ہو چکی تھی۔

درختاں نے اپنے گرد اچھی طرح کمبل پیٹ لیا۔ باہر اچھی خاصی نہ تھی جتنا انہا نے ڈرایا تھا۔ حسب معمول خوف کے مارے اس سردی تھی۔ کمرے میں ہیڑ جل رہا تھا۔ اس لیے سردی کا احساس زیادہ نہ تھا، لیکن فلم جوں جوں آگے بڑھتی گئی، کمر اس ردہوتا گیا۔ کمبل

اور ہیٹر کے باوجود اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈا تر نہ لگی۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ دروازہ بند ہونے سے تنہائی کا احساس زیادہ ہڑھا۔ پھر اس نے ڈر کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلا ہو گا تو اسے بھیا کے دروازے تک بھاگ کر جانے میں آسانی ہو گی۔ کچھ دیر خوف نے پھر زور مارا تو اس نے دروازہ پھر سے بند کر دیا۔

بس فلم کے اختتام تک یہی ہوتا رہا۔ کبھی دو اٹھ کر دروازہ بند کرتی، کبھی کھول دیتی۔

تقریباً دو بجے فلم ختم ہوئی۔ فلم بہت ڈراؤنی تھی، لیکن اتنی ڈراؤنی کا براحال تھا۔ دروازہ اس نے اندر سے لاک کر دیا تھا۔ کمرے کی بھی روشن تھی اور وہ کمبل میں گڑی مرڑی ہوئی لیٹی تھی۔

صحیح کو دروازے پر کسی نے دستک دی تو وہ ہزر بڑا کراچھ بیٹھی۔

کلامی پر بندھی گھڑی پر نظرڈالی تو سات نجک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا پایا ہر بھیہ کھڑے تھے۔

”نہ ہے، رات کو آپ نے فلم دیکھی اور وہ بھی ہو رہا تھا، لیکن یہ آپ اتنی بہادر کمب سے ہو گئیں کہ اکیلے ہی فلم دیکھ لی۔ میری

معلومات کے مطابق تو آپ خاصی ڈرپُک واقع ہوئی ہیں۔ ہو سکتا ہے، دس گیارہ سال میں آپ نے ترقی کر لی ہو اور ڈرنا چھوڑ دیا ہو۔“

”بھیا، رات کو فلم بڑی خطرناک تھی، مجھے پڑا اڑ لگا۔“

”ایسی فلم میں تباہی نہیں دیکھنا چاہئیں۔“

”میں نے رات کو بھابی سے کہا تھا بیٹھنے کو، لیکن تمہیں تو فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”ہاں، اس معاملے میں وہ میری طرح بدقدوق ہے۔“

زبردستی آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن نیند کہاں؟ رہ رہ کر قلم کے مناظر اس کی نظروں میں گھوم رہے تھے۔

کروٹ لیتے ہوئے بیڈ ذرا بھی چہ چڑا تا تو درخشاں کے اس سردی میں پسینے چھوٹ جاتے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگتی۔

اس وقت اسے گل افشاں بڑی شددے سے یاد آ رہی تھی۔ وہ ہوتی تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ وہ اس سے لپٹ کر سو جاتی۔ ڈر پسرو لگتا، لیکن کسی کے پاس ہونے کا احساس بھی ہوتا۔ اس کا جگی چاہا کہ وہ بھابی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دے اور فاخرہ کو اپنے ساتھ لے آئے، لیکن پھر جھیک آڑ سے آگئی۔ بھابی کیا سوچیں گی کہ یہ کس قدر ڈرپُک لڑ کی ہے۔

بس اسی ادھیر بن میں ڈرتے ڈرتے اسے نیندا آگئی۔

ڈین نیکل کر آف سائنس ان کے بہت اچھے دوست ہیں۔ وہ ان سے
بھی تمہارا تعارف کروادیں گے، اس طرح تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو
گی۔ پھر تم وہاں سے اکیلی واپس آ جانا۔ میرے دفتر کا ٹیکنون نمبر گھر
کا پتا اپنے پاس رکھ لو جو راستہ بھولنے کی صورت میں کام آئے گا۔

ٹھیک ہے؟“ باہر بلال نے اس کی طرف اپنا سکارڈ بڑھاتے ہوئے
کہا جس پر دفتر کا ٹیکنون نمبر اور گھر کا پتا بھی درج تھا۔

”درخشاں ناشتہ! فاخرہ نے باور چی خانے سے پکارا۔

”اچھا بھائی۔“ درخشاں نے جواب دیا۔ ”میں داشت برش کر
کے آتی ہوں۔“

”ارے فاخرہ، اسے ابھی سونے دو، تو بچے اٹھا کر ناشتہ کروا
دینا۔“ باہر بلال نے باور چی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”نیند
پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔“

”تب ہی تو خوب نہ ہرہی ہے، دونوں بندوقوں میں۔“ درخشاں
نے چھپیرا۔

”اے درخشاں!“ میں سب سن رہی ہوں تمہاری بکواس۔“ باور چی
خانے سے فاخرہ کی آواز آئی۔

”بھابی!“ میں تو آپ دونوں کی تعریف کر رہی ہوں۔“
”اچھا درخشاں!“ میں یہ کہہ رہا تھا، میرے پاس وقت کم ہے۔ دس

بار و منٹ بعد میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تم ایسا کروڑات کو جاگی
ہو تو نو بجے تک سو جاؤ، دس بجے پروفیسر ڈینی آئیں گے تمہیں
یونیورسٹی لے جانے کے لیے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں خود تمہیں
ساتھ یونیورسٹی چلوں گا، مگر میرے جانے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ میں
بھی وہاں تمہاری ہی طرح ہوں گا۔ ڈینی یونیورسٹی سے اچھی طرح
واتق ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ لسانیات کے پروفیسر ہیں۔

اور اس آدھی بنی تصور یہ کو ایک نظر دیکھا..... پھر بورڈ میں انداز جر لگا

"اچھا نجیک ہے درختان، تم سوجاؤ" میں تمہیں اٹھا لوں گی۔"

پھر وہ کام میں اس قدر محبوہ تی کہ اسے وقت کا انداز و نہ رہا۔

"اوے کے بھابی۔" یہ کہہ کر وہ اپس پلٹی اور بیڈ پر کسی شب تیر کی طرح

کر کام شروع کر دیا۔

گری اور پانچ بیت کے اندر نیند کی آنکوش میں چلی گئی۔

درختان جب سونے کے لیے لیٹی تھی تو اس کے ذہن میں یہ

با بر بلال، کو خدا حافظ، کہنے کے بعد فاخرہ نے دروازہ بند کیا۔ پھر

بات موجود تھی کہ اس نے نوبیجے اٹھنا ہے۔ اس خیال نے گھری کے

وہ درختان کے کمرے میں داخل ہوئی درختان بڑی گہری نیند میں

اتراں کی طرح کام کیا۔ نجیک نوبیجے اس کی آنکھ پٹ سے کھل گئی۔ چند

تھی۔ اس نے آہستگی سے ٹوی ٹرالی کو کھینچ کر لاوٹھ میں اس کی جگہ

سینڈا سے اپنے حواس درست کرنے میں لگے۔ پھر وہ اپنے بالوں کا

پر پہنچایا اور پھر درختان کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

جوڑا بنتی ہوئی بیڈ سے اٹھ گئی۔

ادھر سے مطمئن ہو کر وہ اپنے کمرے میں پہنچی۔ لکڑی سے پردہ

وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر سوئی تھی، لیکن اس وقت دروازہ بند تھا۔ اس

سر کایا، لیکن باہر بہت کیر تھی، اس لیے پردہ سر کانے کے باوجود کمرے

میں روشنی نہ ہوئی۔ پردہ برابر کر کے اس نے نیبل یمپ روشن کر دیا۔

جب اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنا چاہا تو

میز پر کھے ڈرائیک بورڈ کو سیدھا کیا پھر میز کی دراز سے تالاکھوں کر

وہ نہ کھلا۔ دروازہ لاک تھا۔ پھر اچانک اسے رات کی قلم یا داگنی اور

ایک روپ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ اس کا گذ کو پنوں کے ذریعے بورڈ پر لگایا

اٹھ کر بھاگی۔

فاخر نے چابی سے کرے کا تالا کھولا اور مسکراتی ہوئی درختان سے پٹ گئی۔

”ڈریں تو نہیں؟“

”ویسے آپ نے خوفزدہ کرنے میں کوئی کمر بھی نہ چھوڑ دی تھی۔“
درختان نے سمجھی گئی سے کہا۔

”ہائے، تم تو سچ پنج ڈر گئیں۔“ فاخر و نگر مند ہوتے ہوئے بولی۔

”بس، آپ دو چار منٹ اور دروازہ و نہ کھولتیں تو میں کھڑکی سے باہر چلا گئے لگانے والی تھی۔ مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ یہ مرکان آسیب زدہ ہے۔“

”چل پگی۔“ فاخر نے پیار سے اس کے رخسار پر چیت لگائی۔
”میں نے تو ایسے ہی مذاق میں تالا لگا دیا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس

ایک خوف کی ابراس کے جسم میں مراثیت کر گئی۔

یہ دروازہ باہر سے بھابی نے کیوں لاک کیا ہے؟ کیا وہ گھر میں نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ شاپنگ کرنے چل گئی ہوں، لیکن انہیں اس طرح بند کر کے تو نہیں جانا چاہئے۔ کرے کا دروازہ بند کرنے کے بجائے انہیں گھر کا دروازہ بند کرنا چاہئے تھا۔

پھر درختان نے چابی کے سوراخ سے باہر جھانکنے کی کوشش کی، لیکن اسے سوائے دیوار کے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر وہ زور زور سے دروازہ پینٹے گئی۔

زور زور سے دروازہ پیٹے جانے پر فاخرہ کو ایک دم ہوش آگیا۔
اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو نونج چکے تھے۔ پھر اس نے جلدی جلدی پنیں نکال کر اس کا غذہ کورول کیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا کا غذہ بورڈ پر لگادیا۔ اس کا غذہ پر ایک نامکمل لینڈ اسکیپ بنایا تھا۔ پھر جلدی سے

حرکت کو آسیب کی کارستانی سمجھو گئی تو میں ہرگز ایسا نہ کرتی۔“

”آپ کیا کر رہی تھیں اس وقت؟“ درخشاں نے پوچھا۔

”میں ایک تصویر پر کام کر رہی تھی، تمہیں ہے کچھ آرٹ سے دلچسپی یا تمہارا ذوق بھی عورت کو انناس سمجھنے کی حد تک ہے۔“

”آپ کسی حد تک تمہیک کہہ رہی ہیں۔“ درخشاں نے برا مانے بغیر کہا۔ ”سمجا تھا جسے انناس وہ عورت نہیں۔ اپنا بھی کچھ اسی طرح کا حال ہے۔“

”پھر تو تم سے اس موضوع پر بات کرنا فضول ہی ہوگا۔“ ناخرو نے کہا۔

”بھابی، آپ کو یہ آرٹ سے کس طرح لگاؤ ہو گیا؟ پاکستان میں تو گی تو شاید تمہیں حیرت ہو۔“ ایسا کوئی چکرہ تھا۔“

”آرٹ سے دلچسپی تو مجھے شروع سے ہے، لیکن کبھی اسے سنجیدگی

سے لیا نہ تھا۔ یہاں تباہی نے مجھے اس کی طرف راغب کر دیا۔ وقت گزارنے کا یہ بہت خوبصورت مشغله ہے۔“

”آپ نے یہاں کسی سے سیکھا یا بس خود ہی برش چلانا۔“ درخشاں نے پوچھا۔

”انڑو یو شروع ہو گیا۔“ ناخرو نے بنتے ہوئے کہا۔

”جی جناب اور آپ یہ دیکھیں کہ انڑو یو لینے یہ بندی کتنی دور سے آئی ہے۔“ درخشاں مسکرانے۔

”درخشاں“ میں نے یہاں ایک آرٹ آکڈیمی میں دوسال کا کورس کیا ہے۔ اس مصوری کے علاوہ میرا ایک مشغله اور ہے۔ تم ستو

گی تو شاید تمہیں حیرت ہو۔“

”اچھا وہ کیا؟“ درخشاں نے پوچھا۔

”میوزک۔“ ناخرو نے بتایا۔

سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے ناشتا تیار کرتی ہوں۔ ” یہ کہہ کر فاخرہ نے باور پچی خانے کا رخ کیا۔

” یعنی گانا۔ ” درختاں نے وضاحت چاہی۔
” نہیں بجانا۔ ”

درختاں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا، اپنے بالوں پر برش پھیرا اور پھر باور پچی خانے میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ” ہاں بھابی میں آپ کی کچھ مدد کروں۔ ”

” ہاں! ” درختاں نے حیرت سے کہا۔ ” ارے بھابی، آپ نے امریکا آ کر بڑی ترقی کر لی، آپ کیا بجا تی ہیں؟ ”
” میں والمن بجا تی ہوں۔ ”

” بس، آپ اتنی مدد کریں کہ میز پر بر اجمان ہو جائیں میں ناشتا لارہی ہوں، ” فاخرہ نے خوشدی سے کہا۔

” لیکن والمن تو بہت مشکل انسڑو منٹ ہے۔ ” درختاں نے کہا۔
” دیکھ لواں مشکل کو میں نے آسان کر لیا۔ ” فاخرہ کے لبھے میں فخر تھا۔

” بھابی، ناشتے میں کیا ہے؟ ” درختاں نے پوچھا۔
” تمہیں کیا چاہئے، فاخرہ نے پوچھا۔ امریکی یا پاکستانی ناشتا؟ ”
” ہم تو فقیر لوگ ہیں جو مل جائے خوشی سے کھالیں گے۔ ”
درختاں نے صد الگائی۔

” واو۔ بھابی، پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔ ” وہ با تھر روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ” میں ذرا یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آ جاؤں، پھر سنوں گی آپ سے والمن۔ ”

” پھر صبر سے بیٹھیں اور ناشتے کے میز پر آنے کا انتظار کریں۔ ”

” ہاں ٹھیک ہے۔ پروفیسر ڈینی بھی آتے ہوں گے، تم جلدی

”جی اچھا۔“ درختان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ پندرہ فاخرہ نے صبر کی تلقین کی۔

منٹ لیٹ کیوں آئے ہیں۔“

درختان نے دھیرے سے دروازہ کھولا تو اسے سوٹ پوش شخص مسکراتا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں کالی تھیں، لیکن بال ڈارک براؤن تھے اور پیشانی پر پڑے ہوئے تھے۔ کلین شیو، سرخ سفید رنگ تھے۔ درختان نے اندازو لگایا کہ وہ اس سے آٹھ دس سال بڑے رہے ہوں گے۔

”میں ڈینی ہوں ڈینی آنزک۔“ انہوں نے انگریزی میں کہا۔

”گڈ مارنگ پروفیسر میر انام درختان ہے۔“ درختان بولی۔

”درکھشاں؟“ پروفیسر ڈینی نے اس کے نام کے تلفظ کی ریڑھ مارتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”درختان کا خیال تھا کہ وہ اس جملے کے ساتھ ہی اس سے ہاتھ

اور جب ناشتا درختان کے سامنے آیا تو اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ”قیمه پر اٹھا، میرا پسندیدہ ناشتا، بھاپی فاخرہ زندہ باد۔“

پھر ناشتا کرتے اور خوش گپیاں کرتے ساڑھے نونج گئے۔ ناشتا سے فارغ ہو کر درختان نے اپنا لباس تبدیل کیا اور پھر وہ کاغذات نکالنے لگی جن کی یونیورسٹی میں آج ضرورت پڑتی۔

اسے یقین تھا کہ پروفیسر ڈینی صحیح وقت پر گھر پہنچ جائیں گے، اس لیے اس نے ان کے آنے سے پہلے اپنی تیاری مکمل کر لی تاکہ اگر وہ فوراً چلنے کے لیے کہیں تو وہ ان کے ساتھ نکل سکے، لیکن پروفیسر ڈینی دس کے بجائے سوادس بجے تشریف لائے۔

جب گھر کی گھنٹی بجی تو فاخرہ نے درختان سے کہا۔ ”ذراد کیھو دروازے پر کون ہے، میرا خیال ہے کہ پروفیسر ڈینی ہوں گے۔“

ملانے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ درختاں نے سکون کا سانس لیا اور سما بولی۔ مجھے بھی آپ سے مل کر خوش ہوئی۔ آئیے“ اندرونیق لایے۔“

”کیا آپ چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟“ انہوں نے مسکرا کر سوال کیا۔

”جی، میں یا لکل تیار ہوں، تو یہ اگر تم کافی پی کر گھر سے نکلیں تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا۔“

”کوئی مضاائقہ نہیں، میں نے ساڑھے گیارہ بجے ڈین سے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے۔ پندرہ منٹ میں پہلے ہی لیٹ ہوں جس کی ابھی میں نے معدود تباہیں کی۔ بس ہمارے پاس دس بارہ منٹ ہیں۔“ پروفیسر ڈینی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”کافی پینے میں مشکل سے دس منٹ لگیں گے۔“ درختاں نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہیلو پروفیسر ڈینی۔“ فاخرہ نے ان کو خوش آمدید کہا۔ آئیے“ آئیے۔“

”ہاؤ، مزیا بر،“ کیسی ہیں آپ؟“ پروفیسر ڈینی نے صوف پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سوری میں پندرہ منٹ لیٹ ہو گیا، اصل میں گاڑی کچھ خرے دکھارہی تھی، راستے میں اسے ٹھیک کریا۔ اس لیے دیر ہو گئی۔“

”بھائی، آپ بیٹھیں، میں کافی بناؤں۔“ درختاں نے کہا۔

”نہیں، تم بیٹھو، میں بناتی ہوں کافی۔“ فاخرہ نے کہا، پھر وہ پروفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”کوئی بات نہیں پروفیسر، زندگی میں دیر سویر یو چلتی رہتی ہے۔“

دو منٹ میں فاخرہ کافی بنا لائی، اس عرصے میں سوائے دو تین رکی

کے لیے اس نے پروفیسر ڈینی کی جانب دیکھا۔ ”کیوں پروفیسر ڈینی،
واپسی کتنی دیر میں ہو جائے گی؟“

”مسر زیارتی“ اپنے ان کے لیے لنج تیار رکھیں، یہ ایک اور ڈریٹھ کے درمیان آجائیں گی۔ ”پروفیسر ڈینی نے فاخرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔
”ٹھیک ہے، میں آپ دونوں کے لیے لنج تیار کر لیتی ہوں، آپ
واپسی میں ادھر ہی آئیے گا۔“

”شکر یہ مسٹر زیارتی میں نہیں آسکوں گا، مجھے کچھ کام ہے۔“

اس دونوں کے جانے کے بعد فاخرہ نے بڑی بے قراری سے گھر کا دروازہ بند کیا اور جلدی جلدی کسی کو ٹیلی فون کرنے لگی۔

”آج کا موسم خاصا خوشگوار ہے۔“ پروفیسر ڈینی نے گاڑی
اشارت کرتے ہوئے کہا۔

لیکن مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ یہ بات اس نے کہنا چاہی لیکن

جملوں کے ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ کافی پیتے ہوئے
درخشاں نے پروفیسر ڈینی کو غور سے دیکھا۔

وہ کہیں سے پروفیسر دکھائی نہ دیتا تھا۔
پروفیسر کے بجائے وہ ایک چاق و چوبنڈ سیکرٹ ایجنت زیادہ
دکھائی دیتا تھا۔ شیوی بلیوسوٹ میں وہ کچھ زیادہ ہی پرکشش دکھائی
دے رہا تھا۔

اچھا مس درکھشاں اب ہمیں چلتا چاہتے۔ ”کافی ختم کرنے
کے بعد پروفیسر نے کہا۔

”جی، بالکل چلیں۔“ درخشاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”درخشاں، واپسی کب تک ہو گی؟“ فاخرہ نے انگریزی میں
پوچھا۔

درخشاں کو اندازہ نہ تھا کہ وہاں کتنی دیر لگے گی۔ اس لیے جواب

وجہ سے پناہ مانگتا تھا، لیکن اب اس سے یہاں کی سر دی پناہ مانگتی ہے۔ ”پروفیسر ڈینی نے بنتے ہوئے کہا۔ ”میں پاکستان دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”یہ تو کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں، اس سلسلے میں آپ باہر بھیا سے بات کریں۔“

”لیکن میں جانے سے پہلے تھوڑی تھی اردو سیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک بار بار نے مجھے سکھانا شروع کیا تھا، لیکن پھر معاملہ ٹھپ ہو گیا۔ میں دو چار جملے ہی سیکھ پایا، مثلاً آپ کا کیا حال ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے وغیرہ۔“ پروفیسر ڈینی کی زبان سے اردو کے جملے من کر اسے بڑی طہانیت کا احساس ہوا۔

ایک یہ ہے جو امریکی ہو کر اردو سیکھنے کی بات کر رہا ہے، اردو بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک ہم ہیں جنہیں اردو آتی ہے، پھر بھی ہم

کبی نہیں، وہ بولی ”جی، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ ”کیا آپ کے شہر میں بھی اتنی سردی ہوتی ہے؟“ پروفیسر ڈینی نے پوچھتا۔

”جی نہیں۔“ درخشاں نے مختصر جواب دیا۔ ”پھر تو آپ کو سردی لگ رہی ہو گی۔“

”نہیں، گھر میں تو اتنی نہیں محبوس ہو رہی تھی، لیکن باہر نکل کر معلوم ہوا کہ سردی ہے۔“

”جلدی سے اس سردی کی عادی ہو جائیں، ابھی تو آپ کو یہاں کنی سال گزارنے ہیں۔“

”ہم پاکستانی بڑے سخت جان ہوتے ہیں، ہر طرح کے موسم میں گزارا کر لیتے ہیں۔“

”ہاں میں نے باہر کو دیکھا ہے، شروع میں یہاں آیا تو سردی کہ

”نبیس“ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی، لیکن آپ کی خاموشی

اسے بولنا اپنی توہین تمجحتے ہیں۔

”میں سکھاؤں گی آپ کو اردو۔“ درختان نے بڑے خلوص سے سے شبہ پیدا ہوا۔ بات یہ ہے مس درکھشاں کہ خواتین کے مس کو کہا۔

خارج تحسین پیش کرنا یہاں کی تہذیب کا حصہ ہے۔ آپ کیونکہ ہماری تہذیب کا حصہ نہیں ہیں۔ اس لیے اگر آپ کو میری بات بری گئی ہو تو میں فوراً معدرت کر لوں گا۔“

”کسی کو کچھ کہہ کر پھر معدرت کرنا“ کپایہ بھی یہاں کی تہذیب کا حصہ ہے؟“ درختان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جواب میں پروفیسر ڈینی صرف مسکرا کر رہ گئے۔

یونیورسٹی میں پروفیسر ڈینی کی واقفیت کی بنا پر زیادہ دیر نہ گئی۔

سائنس فیکٹری کے ڈین نے درختان کو خاصی پذیرائی بخشی اور اس طرح وہ داخلے کے مراحل سے باآسانی گزر گئی۔

ایک بجے کے قریب پروفیسر ڈینی نے درختان کو ایک بس شاپ

”وقتی!“ پروفیسر ڈینی نے حیرت سے کہا۔ ”پھر تو شاید میں جلد ہی سیکھ جاؤں۔“

”وہ کیوں؟“ وہ کچھ بھی، کچھ بنہ بھی۔

”بھائی ایسا حسین شیور جسے مل جائے وہ بھلا کیسے نہ سکھے گا۔“

پروفیسر ڈینی نے یہ بات بڑی سادگی سے کہی۔

وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”آپ نے میری بات کا برا تو نہیں مانا۔“ پروفیسر ڈینی نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا آپ نے کوئی برآمانے والی بات کہی؟“ درختان نے اثناسوال کیا۔

ہے منفرد بنادیتی ہے۔ بہر حال تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ راستہ بھول جائیں تو شریف پولیس سے مدد لیں۔ وہ آپ کو نہ صرف آپ کے گھر تک چھوڑ دے گا بلکہ گائیڈ بھی کر دے گا۔ آپ کے پاس گھر کا پتا اور بابر کافون نمبر تو ہے؟“ پروفیسر نے پوچھا۔

”جی ہاں“ ہے۔ درخشاں نے جواب دیا۔

”بس پھر خدا حافظ وہ سامنے نے آپ کی بس آرہی ہے۔“

وہ اسے خدا حافظ کیہ کہ بس میں سوار بھوئی اور مطلوبہ اشانہ پر اتر کر اس نے گھر کی راہ لی۔ اس کا فلیٹ کیونکہ میں روڈ سے بہت کرتا تھا، اس لیے تھوڑا سا پیدل چلنا پڑا، لیکن وہ بغیر کسی سے پوچھنے بے خیر و عافیت گھر پہنچ گئی۔

بابر بالال کا قاییٹ فرست فلور پر تھا البتہ اس نے لفت کے چکر میں پڑنے سے بہتر یہ سمجھا کہ یہ رہیوں کے ذریعے اوپر جائے۔ جب وہ

پر اتار دیا۔
”میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتا، لیکن ایک تو با بر کی بدایت تھی کہ میں آپ کو بس کا راستہ دکھادوں دوسراے آج میری کچھ مصروفیت ایسی ہے کہ میں آپ کو چھوڑ نے نہیں جا سکتا۔“

یہ کہہ کر پھر اس نے درخشاں کو بس کے بارے میں بتایا کہ کہاں اترنا ہے۔

”ویسے یہ راستہ بھولنا بڑا آسان ہوتا ہے کیونکہ نئے آتے والے کو یہاں کے سارے چورا ہے اور بلڈنگ میں یکساں دکھائی دیتی ہیں، لیکن پھر دیسرے دیسرے پہچان بڑھتی جاتی ہے۔ یہی مسئلہ یہاں کے انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ سڑک پر گھومتے پھرتے دور سے سب ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں، لیکن انہی چہروں میں کوئی اپنا چہرہ بھی ہوتا ہے جسے ہمارے اندر کی لگن اسے دوسروں سے الگ کر دیتی

”انگریزوں کی طرح نہیں، امریکیوں کی طرح۔“ درختاں بولی۔

”ایک ہی بات ہے وہ بھی گورے یہ بھی گورے۔“ فاخرہ نے

ہنس کر کہا۔

”آپ ابھی تک کچن میں تھی ہوئی ہیں۔“ درختاں ہاتھ پاؤں پھیلا کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”وہ اپرن بندھ سے ہوئے تھی۔“

”باں، بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔“ فاخرہ نے کہا۔

”یعنی روٹیاں پکانا ہیں؟“ درختاں نے پوچھا۔

”ہاں، تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی۔“

”نہیں،“ آپ صبح سے کام کر کے تھک گئی ہوں گی لا یئے روٹیاں

میں پکا دوں۔“

”ارے نہیں، دوآدمی کی تو روٹی پکانا ہے۔ تم خود تھک کر آ رہی ہو۔“

سیرھیاں چڑھر ہی تھی تو اسے دروازہ کھلانے اور پھر فوراً بند ہونے کی آواز آئی۔

پھر ایک شخص اس کے سامنے سے تیزی سے سیرھیاں اترتا گزر گیا۔ درختاں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی، لیکن جانے اسے یہ احساس کیوں ہوا کہ یہ شخص اس کے گھر سے نکلا ہے۔ اس نے نفس دروازہ کھلانے اور بند ہونے کی آواز سنی تھی، اسے دروازے سے نکلتے تہ دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی اور دروازے سے نکلا ہو۔ اس نے سوچا۔ اس فلور پر چار فلائیٹ تھے۔

گھنٹی بجانے پر کچھ دیر بعد فاخرہ نے دروازہ کھولا اور اسے دروازے پر پا کر کھل اٹھی۔

”ارے، بڑی انگریزوں کی طرح آئی ہو۔“ اس نے گھری دیکھتے ہوئے کہا۔

چھپے ہیں۔ اس نے سوچا، اگر اس جملے میں کوئی معنی چھپے ہیں تو بے شک چھپے رہیں وہ خواہ مخواہ کیوں جھمکے۔ ہو سکتا ہے کہ بات بھائی نے سادگی سے تھی کبھی ہو۔

”اچھا لگا۔ پروفیسر ڈینی بہت ذہین آدمی ہیں۔ خاص طور سے انہیں اپنی بات کہنا خوب آتی ہے۔“ درختان نے بڑی بے تکلفی سے ان کی تعریف کر دی۔

تب فاخرہ نے باور پی خانے سے باہر جہاں کا اور معنی خیز انداز میں بولی۔ ”ایسا کیا کہہ دیا انہوں نے۔“

”وہ بہت مہذب آدمی ہیں۔“ درختان نے سمجھ دی گئی سے کہا۔ ”صاف ظاہر ہے، اگر وہ مہذب ہوتے تو تمہارے بھائی تمہیں ان کے ساتھ کیسے بیچج دیتے۔ اچھا چلو چھپوڑو۔ اس بحث کو کھانا تیار ہے، تم ڈر لیں تبدیل کرو۔“

ہاں یہ تو بتاؤ تمہارا کیا رہا۔ کام ہو گیا؟“ فاخرہ نے باور پی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”جی بھائی، اپنا کام ہو گیا، بس کل سے بات اعادگی سے پونیورٹی جانا ہے۔“

”چلو مبارک ہو۔ ویسے پروفیسر ڈینی کی وجہ سے کافی مدد ملی ہو گی۔“

”جی ہاں، سب کچھ انہوں نے ہی کیا، میں تو بس ان کے ساتھ چلتی رہی۔“

”ان کے ساتھ چلنے کیا لگا؟“ اس نے پوچھا۔ فاخرہ کیونکہ باور پی خانے میں تھی، اس لیے وہ اس جملے کی اداگی کے وقت اس کے پڑرات شد کیکھ کی۔ لبھ سے کوئی خاص اندازہ نہ ہوا کہ یہ بات یونہی کہہ دی ہے یا اس کے پس پر وہ کچھ معنی

ہو۔ وہ ان کے ساتھ بہت بے تکلفی سے بات کرتی تھی، لیکن اس بے تکلفی میں بھی ایک جاپ ہوتا تھا اور یہی جاپ فصیل کا کام دیتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کے لیے لیٹ گئی۔ بیڈ پر لیٹی تو پروفیسر ڈینی اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔

”دور سے دیکھنے پر سب کے چہرے ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں، لیکن انہی چہروں میں کوئی ایسا چہرہ بھی ہوتا ہے جسے ہمارے اندر کی لگن اسے دوسروں سے الگ کر دیتی ہے۔“

یہ بات پروفیسر ڈینی نے کیوں کہی؟ اس بات کا کوئی مطلب ہو سکتا ہے؟ یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ پھر وقت کو پر لگ گئے۔

درخشاں اپنے ریسروچ کے کام میں دھمکی سے جست گئی۔ پروفیسر دینی سے بھی اس کی ملاتا تیں چاری رہیں۔ بھی وہ گھر آ جاتے، بھی

جانے کیوں بھالی کی پروفیسر کے حوالے سے یہ جملے بازی اسے کچھ اچھی نہ لگی۔ ہم جب کسی مرد عورت کو ایک جگہ اکٹھا دیکھتے ہیں تو ہزار مفرود ضم گھڑ لیتے ہیں، جانے کیا کیا سوچ لیتے ہیں، جانے کہاں تک سوچ لیتے ہیں۔ درخشاں کو ایسی یاتوں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ وہ بڑے صاف وہن کی لڑکی تھی۔ مردوں سے بلا جھگ گفتگو کرتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایم ایس سی کرنے کے باوجود وہ یونیورسٹی سے بغیر کسی افسوس کے نکل آئی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ لڑکے اس کے نزدیک نہ آتے ہوں۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی۔ لڑکے اس کے نزدیک ہونے کو اپنی خوش قسمتی گردانے تھے، لیکن وہ ان کے ساتھ کچھ اس طرح کارو یہ اختیار کرتی تھی کہ وہ سب اپنی مکالے بازی بھول کر سیدی را اختیار کر لیتے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکوں کے ساتھ بے اعتنائی یا سخت انداز اختیار کرتی

پھر یہ تو یہاں کاروڑ کا معمول تھا۔ کچھ بارش، کچھ برف باری۔ وہ روزانہ کیسے نیکسی میں سفر کرتی۔ اس کے علاوہ اسے نیکسی میں سفر کرنے سے منع بھی کیا گیا تھا۔ کسی نیکروڈرائیور کی نیکسی میں بیٹھنے سے بطور خاص منع کیا گیا تھا۔

ابھی وہ یہ سب سوچ رہی تھی کہ پروفیسر ڈینی کی گاڑی اس کے نزدیک آ کر رکی۔ ان کی پوری گاڑی سفید ہو رہی تھی۔ پروفیسر نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر درختان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ انہیں دیکھ کر خوش ہو گئی۔ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں پروفیسر؟“ اس نے پوچھا۔ ”میں جہاں بھی جا رہا ہوں،“ بہر حال آپ کو گھر چھوڑ کر جاؤں گا۔“ وہ اولے۔

”اوہ تینک یو پروفیسر۔“ وہ بے تکلفی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ”آج

یونیورسٹی ہل میں جاتے۔ ایک دوبارہ ان کے ساتھ دیستور ان میں کافی پینے بھی گئی۔ اس ساری ملاقاتوں کے باوجود بھی پروفیسر ڈینی نے کوئی ایسی حرکت نہ کی، کوئی ایسی بات نہ کی، جس سے درختان کو دھپکا گلتا۔

ایک دن وہ بس شاپ پر بس کے انتظار میں کھڑی تھی کہ برف باری شروع ہو گئی۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ درجہ حرارت منفی آئندہ رہا ہو گا۔ وہ گرم کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی، لیکن ان کپڑوں کی گرمی جیسے ہوا ہو گئی تھی۔ رائٹ نگر ہے تھا اور جسم بار بار کانپ جاتا تھا۔

بس شاپ تقریباً سنسان تھا۔ ایک دوڑ کے لڑکیاں کھڑے تھے۔ بس کے آنے میں ابھی در تھی۔ اس نے سوچا نیکسی پکڑ کر گھر پہنچ چاۓ، لیکن نیکسی کا کراچی گھر تک خاصاً بن جاتا۔ وہ یہاں پڑھنے آئی تھی، نیکسی کا کر دیا یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ریستوران جا بھی چکی ہوں، لیکن اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ گھر پہنچنے

تو بے پناہ سردی ہے۔“

”یہ تو کچھ بھی نہیں، آجے آجے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔“ پروفیسر ڈینی

گی۔“

”آپ کوئی بچی تو نہیں ہیں، اپنا بھلا بر اچھی طرح سمجھتی ہیں۔“

پروفیسر ڈینی کے لیے بھائی کا پریشان ہونا نئی بات تھی، انہوں نے کچھ اور ہی مطلب لیا۔

”ہاں ٹھیک ہے کہ میں بچی نہیں ہوں، اپنا بھلا بر اچھی طرح سمجھتی ہوں، لیکن پروفیسر میں اپنے آپ کوئی حادثے سے تو نہیں بچا

سکتی۔ دراصل ہمارے معاشرے میں ہمارے گھرانوں میں ایک دوسرے کا اسی قدر رخیال رکھا جاتا ہے۔ میں جب تک گھر پہنچ نہیں

جاؤں گی، وہ گھر میں بے قراری سے شہلتی رہیں گی اور میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے لیے ذرا بھی پریشان ہوں۔“ درختاں نے کہا۔

”بھر ہماری تو آئسکریم بن جائے گی۔“ درختاں نے اپنے

دستاں نے اتار کر ہاتھوں کو ایک دوسرے پر رکڑا۔ پروفیسر ڈینی نے

گاڑی شارٹ کرتے ہوئے اس کے نازک اور خوبصورت ہاتھوں کی

طرف دیکھا۔ اسی وقت درختاں نے اپنے ہاتھوں پر ان کی نظریں

محسوس کیں۔ اس نے قورا دستا نے پہن لیے۔

پروفیسر ڈینی نے گھر انسانس لیتے ہوئے گاڑی کی سپینڈ تیز کر

دی۔

”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کہیں بیٹھ کر کافی پی لیں۔“

”جی، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ایک دوبار

کپڑوں کو جھنک کر برف صاف کی۔ درختان کے کپڑوں پر بھی کہیں کہیں برف جمی ہوئی تھی۔ پروفیسر ڈینی نے سوچا کہ وہ اس کے کپڑوں سے برف صاف کر دے اور یہ کوئی ایسی میوب بات بھی نہ تھی، لیکن پھر بھی اس نے اپنے اٹھتے ہوئے ہاتھ کو روک لیا اور درختان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اپنے اوپر جمی برف جھاؤ لیں یا مجھے اجازت دیں۔“

درختان نے یہ سنتے ہی فوراً اپنے لباس سے برف اچھی طرح صاف کر دی اور سکرا کر بولی۔ ”بس۔“

”بس۔“ پروفیسر ڈینی نے اسے گھری نگاہوں سے دیکھا۔ ”آج آپ کو دیر ہو گئی۔“ درختان نے ان نگاہوں سے نیچنے کا توڑ کیا۔

”ہاں وہ کل مجھے ایک لپکھر دینا ہے، لاہبری یہی میں اس کے لیے

”تو کوئی بات نہیں میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔“

”نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا، ہم کہیں بیٹھ کر کافی ضرور پہنیں گے، لیکن زیادہ درنہیں جائیں گے۔“ درختان نے درمیان کی راہ اختیار کی۔

”چلے، یہ ٹھیک ہے۔“ پروفیسر ڈینی نے کہا اور کچھ دور آگے جا کر ایک کیفے کے سامنے گاڑی روک دی۔

کیفے اس وقت کھچا کچھ بھرا ہوا احتہا دروازے پر کھڑے ہو کر دونوں نے جائزہ لیا۔ پھر انہیں ایک میز خالی دکھائی دے ہی گئی۔ یہ میز بھی اچھی جگہ تھی، کھڑکی کے قریب، یہاں بیٹھ کر باہر کا نظارہ بھی ہو سکتا تھا۔ پروفیسر ڈینی نے میز پر بیٹھتے ہوئے کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا۔ باہر ہر طرف، دور تک برف ہی برف پھیلائی تھی۔

خود پروفیسر کے کپڑوں پر بھی برف جمی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے

میں یہاں جلد از جلد ریسرچ مکمل کروں اور اپنے گھر کی راہ لوں۔“

درخشاں نے کہا۔

”اگر آپ برائیہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟“ پروفیسر ڈینی تے کہا۔

”ہاں پوچھیں۔“ درخشاں نے سڑک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ برف باری اب بھی جاری تھی۔

”وہاں آپ کی کوئی راہ دیکھ رہا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ارے نہیں پروفیسر، ایسی کوئی بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے یہ نیو یارک بہت بڑا ہے یا یہاں کے لوگ پسند نہیں آئے۔“

”ہاں یہاں کے لوگ بہت برقے ہیں۔“ درخشاں نے پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے از راہ مناق کہا۔

”مجھے بھی آج خاصی دیر ہو گئی۔ لیب میں کام کرتے ہوئے کچھ وقت کا اندازہ بھی نہ ہوا۔ لیب میں ویسے بھی دن میں باب روش رہتے ہیں۔“

”کل پرسوں، آپ نے پروفیسر براؤن سے بات ہوئی تھی۔ وہ آپ کی خاصی تعریف کر رہے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ اپنا کام وقت سے پہلے ہی ختم کر دیں گی۔“ پروفیسر ڈینی نے اسے تعریف نظر وہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ درخشاں نے خوش ہو کر کہا۔

”کیوں پاکستان جانے کی بہت جلدی ہے کیا؟“ پھر وہ دیڑ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”کافی۔“

”اپنے ولن کون والپس نہیں جانا چاہتا، میری بھی خواہش ہے کہ

چار ماہ ملتے ہوئے ہو گئے ہیں، گوان ملاتا توں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، لیکن میرے لیے یہ ملاتا تیں اشناہ ہیں۔“

”ایسا اشناہ جنہیں فردخت نہیں کیا جا سکتا۔“ درخشاں نے بات پھر مذاق میں اڑانا چاہی۔

انتے میں دیڑکافی رکھ گیا۔ درخشاں کافی بنانے لگی۔ پروفیسر ڈینی لیکن خاموش ہو گیا۔ وہ درخشاں کو کافی بناتے ہوئے خاموشی سے دیکھنے لگا۔

”جی پروفیسر ڈینی! آپ کیا فرمادے ہے تھے؟“ درخشاں نے اس کی طرف کپڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں آپ سے اپنی شادی کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔“

”شادی کا لفظ سن کر درخشاں کو ایک دم دھپکا سالگا۔ یہ اپنی شادی ذکر کروں، ہو سکتا ہے، باہر نے میرے بارے میں کچھ بتایا ہو، تمیں تین کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتا ہے؟ پہلے سے شادی شدہ ہے یا

”درخشاں! میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا۔“ انہوں نے اس کے مذاق پر کوئی توجہ نہ دی۔

”آپ جو بات کہنا چاہتے ہیں، ضرور کہیں، لیکن اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ بات ایسی نہ ہو کہ اس سے آپ کا انتخ خراب ہو جائے۔ میں دروغ مل آپ کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتی ہوں۔“ درخشاں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا۔ اسے اچانک یہ احساس ہوا تھا جیسے پروفیسر ڈینی کوئی ایسی بات کہنے والا ہو جے درخشاں کے لیے سنا محال ہو۔ ایسی باتیں تو اس نے پاکستان میں نہیں سنبھالیں تو دیار غیر میں کیا سنت۔

”مجھے نہیں معلوم یہ بات بتانا آپ کو ضروری ہے یا نہیں، لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ آپ سے اپنے بارے میں کچھ بات کروں، اپنا کچھ ذکر کروں، ہو سکتا ہے، باہر نے میرے بارے میں کچھ بتایا ہو، تمیں تین

اب کرنا چاہتا ہے؟

”میں سمجھی نہیں!“ وہ واقعی تینیں سمجھی تھیں۔

”میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں شادی شدہ ہوں، لیکن میری بیوی میرے ساتھ نہیں رہتی۔“

پروفیسر ڈینی کی شادی کا ذکر اسے کچھ اچھا نہ لگا، لیکن وہ اس بات کا تجربہ کر سکی کہ ایسا کیوں ہوا۔ بہر حال اس نے اپنے جذبات پھپاتے ہوئے بڑی ہمدردی سے کہا۔ ”یہ بات سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔“

کافی ختم ہو چکی تھی۔ جو بات اس نے کہنا تھی وہ بھی کہہ چکا تھا۔ اب دیر ہو رہی تھی۔

”آئیے چلیں، باقی باتیں گاڑی میں کر لیں گے۔“

پھر وہ نے زبردستی کافی کامل ادا کیا۔ پروفیسر ڈینی نے اسے بل

تیرے عشق میں

عشق اگر واقع عشق ہے تو وہ ہر حال میں قابل ستائش ہے وہ مجازی ہو یا حقیقی، سفلی ہو یا اونوری، کسی عام شخص نے کیا ہو یا خاص شخص نے۔ عشق کی ایک ایسی ہی داستان جس میں ایک لڑکی کو حقیقی عشق ہو گیا اور پھر وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

ابھی پڑھئے ”اردو رسالہ“ پر

دینے سے بہت روکا، لیکن وہ تھا مانی۔

گاڑی میں بیٹھ کر دوسری یا تیس ہوتی رہیں، لیکن شادی سے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ درختان نے کچھ پوچھا، پروفیسر ڈینی نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور دیسرے دیسرے پر ہیاں چڑھنے لگی۔

لکھنی بجانے پر فوراً ہی فاخرہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھ پکھ جانے پر فوراً ہی فاخرہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھ میں والمن تھا۔

”اوہ والمن سے شوق فرمایا جا رہا تھا۔“ درختان نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”درختان! آج تم نے بڑی دیر کر دی؟ کہاں رہ گئی تھیں؟“

”کہاں رہتی بھائی! لیب میں کام کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔“ درختان نے بتایا۔ ”پھر یونیورسٹی سے نکلی تو بس شاپ پر پروفیسر ڈینی مل گئے۔ ان کا ملنا اچھا ہوا، وہ کم از کم گھر تک چھوڑ گئے۔ ورنہ بس شاپ سے گھر تک پیدل آنا پڑتا اور وہ بھی اس

گھر پہنچ کر جب پروفیسر ڈینی نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے گلڈ میں والمن تھا۔

”پھر آؤں گا۔ اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے،“ ایک جگہ پہنچنا ہے۔“ پروفیسر ڈینی نے مغدرت چاہی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت پروفیسر کو کہیں نہیں جانا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس بات کا ذکر کیفے میں ہی کرتے، بہر حال، جانے والے کو زبردستی نہیں روکا جا سکتا جبکہ درمیان میں کوئی رکنے والا رشتہ بھی نہ ہو۔

برف باری اب رک چکی تھی، لیکن ٹھنڈا بڑھ گئی تھی۔ درختان نے

احساس کم ہوا تو اس نے کوٹ اتار دیا اور بڑی آسودگی سے صوفے پر لیٹ گئی۔

”بھائی، یہ گھر بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ گھر میں گھستے ہی ایک آسودگی کا احساس ہوتا ہے، اس کی گرم آغوش میں کس قدر مزدہ ہے۔“ درخشاں نے لیٹتے لیٹتے کہا۔

”لیکن سارے گھر ایک جیسے نہیں ہوتے۔“ فاخرہ کافی کا گل اس کے ہاتھ میں تھما کر بولی۔ ”کچھ گھر ایسے ہوتے ہیں جہاں گھستے ہی تباہی کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ گھر ایسے ہوتے ہیں جو کافی کو

دوڑتے ہیں اور کچھ گھر ایسے ہوتے ہیں جہاں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ آدمی سوچتا ہے، کہیں باہر ہی رات بسر کرے تو اچھا ہے۔“ ”پروفیسر ڈینی بھی آج کل شاید اسی قسم کے گھر میں رہ رہے رکھا اور مسکراتی ہوئی کچن میں چل گئی۔

فائلیٹ چاروں طرف سے بند تھا۔ سامنے ہیٹر روشن تھا۔ سردی کا ہیں؟“

درخشاں درمیان میں سے کیفے کا ذکر گول کر گئی۔ اس کے نزدیک یہ کوئی معیوب بات نہ تھی، لیکن بھائی کو بات کا بتلنگر بنانے میں برا امزو آتا تھا اور وہ چاہتی تھیں تھی کہ اس کی کوئی بات بتلنگر بن کر اس کے بھائی کے سامنے پہنچے۔

فاخرہ نے اس کی بات سن کر کوئی تبرہ نہ کیا۔ یہ بھی نہ کہا کہ پروفیسر ڈینی اگر یہاں تک آئے تھا تو اور پر کیوں نہ آئے۔ ”کافی تو پیو گی؟“ فاخرہ نے پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں، آپ کے ہاتھ کی کافی تولا جواب ہوتی ہے۔“ ”شکر یہ اس عزت افزائی کا۔“ یہ کہہ کر فاخرہ تے والکن میز پر فائلیٹ چاروں طرف سے بند تھا۔ سامنے ہیٹر روشن تھا۔ سردی کا

یہ بات دس پندرہ دن بعد کی ہے۔

و دلیب میں بڑے انہاک سے کام کر رہی تھی کہ اچانک اسے احساس ہوا جیسے کوئی پیچھے کھڑا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سامنے پروفیسر ڈینی کو پایا۔

”ارے آپ!“ درخشاں نے خوشنگوار خیرت سے کہا۔

”آپ سے ملاقات ہوئے کافی دن ہو گئے تھے یا شاید زیادہ دن نہ ہوئے ہوں۔ یہ مخفی میرا احساس ہو۔ میں نے سوچا، آپ سے چل کر مل لوں۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں پانچ منٹ میں فارغ ہوتی ہوں۔ پھر چل کر کہیں ٹیکھتے ہیں۔“

میں منٹ کے بعد وہ ایک بہت خوبصورت ریستوران میں ٹیکھتے ہوئے تھے۔ پروفیسر ڈینی کافی اور کچھ کہانے پینے کی چیزوں کا آرڈر

”ہاں اس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہے۔“ فاخرہ بولی۔ ”ہائے بے چارہ پروفیسر، کتنا بد قسمت ہے وہ؟“ کتنا خوبصورت، کتنا لمسا ر اور کتنا خوش اخلاق آدمی ہے۔ اس کے باوجود کس قدر تباہ۔ اصل میں اس کی بیوی بڑی تیز مزاج، جنگلرال او اور بے پرواہی کی ہے۔ ان دونوں میں ایک منٹ نہیں بنتی۔ تمہیں کچھ بتایا پروفیسر نے؟“

”بس اتنا ہی کہ وہ شادی شدہ ہیں اور ان کی بیوی ان کے ساتھ نہیں رہتی۔ اچھا چھوڑیں بھابی اس قصے کو آپ ذرا ولکن پر کوئی غمگینی تی دھن چھیریں۔“ فاخرہ ولکن بہت اچھی بجا تی تھی۔ اس شام درخشاں نے جی بھر کر ولکن سن۔ وہ ولکن سنتی رہی اور اس کی نگاہوں میں وہ شخص گھومتا رہا جو اس کے دل کے بند کو اڑوں پر آہستہ آہستہ دستک دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

زیادہ بولنے کی کوشش کریں۔“

انتہے میں ویٹرڑے لے کر حاضر ہو گیا۔ درختان کافی بنائے گئی۔ کافی بناتے بناتے اسے اپنے چہرے پر کسی کی نگاہوں کا احساس

اس نے اچانک اپنی نگاہیں انہاں عیسیٰ تو پروفیسر کو بڑی محیت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پویا۔

”کافی۔“ درختان نے کافی کاگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کی محیت توڑنے کی کوشش کی۔

تب اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ دلا اور اس کے سامنے ایک چیز رکھ دی۔

”یہ کیا ہے؟“ درختان نے پریشان ہو کر اس چیز کو دیکھا۔ ”یا آپ کے لیے ہے۔“ وہ بولا۔

دے چکا تھا۔ وہ کچھ خاموش سا تھا۔ درختان یوں محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی بات اس کے لیوں پر ہو اور کچھ کہنے کی بہت نہ کر پا رہا ہو۔

”کہیے پروفیسر، آپ کی اردو کتاب تک پہنچی؟“

یہ سن کر وہ چونکا جیسے کہیں خیالات میں گم ہو۔ پھر مسکراتے ہوئے ہوا۔

اردو میں بولا۔ ”ہم اس کتاب سے سیکھ رہا ہوں۔“

”میں اس کتاب سے سیکھ رہا ہوں۔“ درختان نے تصویح کی۔

”اوہ! میں میں۔“ پروفیسر ڈینی نے میں میں کی گردان کرتے ہوئے کہما۔

”وہ کیسی کتاب ہے، اس سے کچھ سیکھنے میں مدد ملن رہی ہے؟“

”وہ بہت اچھی کتاب ہے، ابھی میں الفاظ کا ذخیرہ بڑھا رہا ہوں۔“ پروفیسر ڈینی نے انگلش میں کہما۔

”کچھ تلفظ کا مسئلہ ہے۔“

”تلفظ تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گا، اس کی فکر نہ کریں، بس زیادہ سے

اس مسئلے پر گل افشاں سے اس کی اڑائی رہتی تھی۔ وہ دونوں کمیں باہر نکلتیں تو گل افشاں اسے ٹوکتی۔ ”باجی؟ میک اپ نہ سہی بونڈوں پر لپ اسٹک ہی لگا اور الگتا ہے۔“

”اری چھوڑ، اس فضولیات میں کون پڑے۔“ یہ کہہ کر پرس اٹھاتی اور دروازے سے نکل جاتی۔ تب گل افشاں کو مجبوراً اس کے پیچے جانا پڑتا۔

لیکن شادی بیاہ کے موقع پر گل افشاں اڑ جاتی۔ ”باجی؟ اگر آج تو بیواؤں کی طرح گھر سے نکلی تو مجھے سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

”تو تو سہا گمن بن کر چل رہی ہے، بس اتنا کافی تھیں کیا؟“

”باجی؟ تو سمجھتی کیوں نہیں، ایسے موقعوں پر ہزار نظریں چھیرے پر پڑتی ہیں۔ عزیز رشتے دار سہی دیکھتے ہیں۔ پھر خاندان کے لڑ کے بھی ہوتے ہیں وہاں۔“

”لپ اسٹک۔“ درختاں نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میک اپ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ نے مجھے ان چیزوں کو کبھی استعمال کرتے نہ دیکھا ہوگا۔“

اور یہ بات تھی بھی حقیقت۔ میک اپ سے واقعی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چہرے اور آنکھوں کے میک اپ کی تو دور کی بات ہے وہ لپ اسٹک اور نیل پاش کے استعمال کی بھی روادار نہ تھی۔

قدرت نے اسے سفید دودھ جیسی رنگت ساختی تھی۔ بڑی یہ زی سیاہ جگہ تی آنکھیں، ان پر گھنیری پلکوں کا سایہ، باریک کمان جیسی بھویں بھرے بھرے گلابی ہونٹ۔

اسے بھلامیک اپ کی کیا ضرورت تھی۔ دیسے وہ میک اپ اس لینے نہیں کرتی تھی کہ اسے کسی منگمار کی ضرورت نہ تھی۔ میک اپ سے وہ فطری طور پر کچھ ارجمند تھی۔

جب وہ امریکا آئی تو بھابی فاخرہ کو بھی یہ بات بڑی عجیب گی۔
اس نے شروع شروع میں اسے میک اپ کی طرف راغب کرنے کی
بہت کوشش کی، لیکن وہ دام میں نہ آئی۔ تن تھک ہار کر فاخرہ نے اسے
اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب اس کی زندگی میں یہ نیا مرحلہ آگیا تھا۔
پروفیسر ڈینی اس کے لیے لپ اسٹک خرید لائے تھے، انہیں کیا بو
گیا تھا؟

”ہاں میں جانتا ہوں، آپ میک اپ نہیں کرتیں۔ میں نے آپ
کے چہرے پر کبھی میک اپ نہیں دیکھا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کم
از کم لپ اسٹک کا استعمال ضرور کریں، بے شک، ہلکی تی لگانیں۔“
اب درخشاں میں پروفیسر ڈینی کی دلچسپی بڑی حد تک واضح ہو گئی۔
تھی۔ درخشاں نے ایک لمحے کو سوچا کہ اس محبت بھرے تھے کوئی سے
بھروسے گل افشاں کی محبت کے آگے تھیار ڈالنا پڑتے۔

”میں شادی میں جا رہی ہوں یا وہاں خود کو پسند کروانے جا رہی
ہوں، مجھے نہیں اچھا لگتا بننا سنورنا، یہ میک اپ، یہ فضولیات۔“
درخشاں چھپنے ملے جاتی۔

”آج اگر تو نے لپ اسٹک نہ لگائی اور بالوں کا جوڑا نہ بنایا،“ پھر
دیکھیں تیری کیسی خبر لیتی ہوں۔ ”گل افشاں بھی مقابلے پر آ جاتی۔
”کیا کر لے گی تو یہ؟“ درخشاں پوچھتی۔

”ابھی ابو کو جا کر بتاتی ہوں۔“ وہ دھمکی دیتی۔
”یہ کیا بکواس ہے، ابو کا اس بات سے کیا تعلق؟“
”بس ڈرگئی نا، چل اب سیدھی طرح ادھر بیٹھ جا،“ میں صرف لپ
اسٹک لگاؤں گی، نیل پاش لگاؤں گی اور تیرے بالوں کا جوڑا بناؤں
گی۔“

چیز اس کے لیے لے آئے گا۔ پھر یہ سالہ بڑھتا ہی جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اس سے فضول قسم کی توقعات باندھ لے۔

ان سارے خدیشات کے پاؤ جو داس تھے کو واپس کرنے کی اپنے اندر بہت نہ پاتی تھی۔ وہ اسے لتجابھری نظرؤں سے دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے درمیان کاراستہ نکلا۔

”پروفیسر ڈینی، آپ کا یہ بیش قیمت تھنہ میں قبول کراویں گی، لیکن آپ کو میرے ساتھ ایک عہد کرنا ہو گا۔“

”میں سارے عہد کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے جذباتی انداز اختیار کیا۔

”سارے عہد نہیں، صرف ایک۔“ درخشاں نے ہنس کر کہا۔ ”یہ آپ کا پہلا اور آٹھویں تھنہ ہو گا۔“

”یہ بہت مشکل عہد ہے۔“ وہ بولا۔

نمکراتے، لیکن ایسا کرنے کی اس میں بہت نہیں تھی۔ وہ پروفیسر ڈینی کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ بے چارہ اس کی خاطر شاپنگ کرنے پر مجبور ہوا۔ جانے کس طرح اس نے یہ لپ اسٹک خریدی ہو گی۔ سیلز گرل کی دبی دبی مسکراہٹ کا اس نے کس طرح مقابلہ کیا ہو گا۔

اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ اس کا چہرہ پروفیسر کے لیے کس قدر کشش کا باعث بن گیا ہے۔ اس نے پروفیسر کی نگاہوں کو بارہا پہنچھے پر محسوس کیا تھا، لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ قدر غور سے اس کے چہرے کو دیکھا کرتا ہے۔ وہ یہاں تک جانتا ہے کہ وہ لپ اسٹک بھی استعمال نہیں کرتی۔

وہ پروفیسر کی اس توجہ کو کیا سمجھے؟ محبت سمجھے، لگاؤ سمجھے یا محض دوستی؟

اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے اس تھنے کو قبول کر لیا تو وہ کوئی اور

اس نے لپ اسٹک کو بڑے نفاست سے لگایا اور اپنی صورت آئینے میں دیکھنے لگی۔

”لیکن کرنا ہوگا۔“ درختان نے زور دے کر کہا۔

”اچھا تھیک ہے، میں کوشش کروں گا کہ آئندہ کوئی چیز آپ کو نہ دوں۔“

”کوشش نہیں، پکا عہد۔“

”اچھا باب، عہد یہ نیرا آخری تھا ہے۔“ بالآخر ڈینی کو کہنا پڑا۔

”تھیک یو۔“ درختان نے خوش ہو کر کہا اور اس لپ اسٹک کو اٹھا لیا۔ اسے الٹ پلت کر دیکھا۔ پھر اسے کھولا اس کو دیکھ کر خوش کا اظہار کرتی رہی۔

اس کے بیگ میں اس وقت آئینے نہیں تھا، نہیں تو وہ نہیں بیٹھے بیٹھے اپنے ہونٹوں پر یہ لپ اسٹک لگا لیتی۔ پھر وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور پروفیسر ڈینی سے مخاطب ہو کر یوں۔ ”میں ایک سینٹ میں آئی۔“

اس نے ریستوران کے ٹو انکٹ کا رخ کیا، وہاں آئینہ موجود تھا۔

گل افشاں جب زبردستی اس کا بناو سنگھار کیا کرتی تو وہ کبھی پلٹ کر آئینے نہ دیکھتی تھی، لیکن آج اس نے اپنے آپ کو مختال زاویوں سے دیکھا۔

لپ اسٹک کا شیڈ اس کے ہونٹوں سے ہم رنگ تھا۔ اس نے اس رنگ کو اور گہرا کر لیا۔ وہ اچھی لگ رہی تھی اور بار بار اپنے آپ کو آئینے کے نزدیک کر کے دیکھ رہی تھی۔

جب وہ واپس میز پر آئی اور پروفیسر ڈینی کے سامنے بیٹھی تو اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں، اسے شرمی محسوس ہوئی، لیکن اس نے خود کو سنبھال لے رکھا۔

پروفیسر ڈینی نے جب اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگی دیکھی تو

لکا کیک اس کی آنکھوں میں بہت سے چدائیں جل اٹھے۔ وہ خوشی سے چھوم اٹھا اور اس کے ہاتھ پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تھینک یو۔“ ہوئے کہا۔

”ایسا غلطی سے ہو گیا۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”میں چاہتا ہوں، نیبی غلطی مستقل ہوتی رہے۔“

”چلے، آپ کو صرف ڈینی کہلوانا اچھا لگتا ہے تو میں یہ کہہ دیا کروں گی۔“ درختان نے کہا۔

”تھینک یو۔“ ڈینی کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر چدائیں جل اٹھے۔

پھر وہ کچھ دیر اور ریستوران میں بیٹھے۔ اس کے بعد درختان کی خواہش پر ڈینی نے اسے یونیورسٹی واپس چھوڑ دیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے لیبارٹری کے ٹوٹک میں جا کر ٹشوپ پر سے رگڑ کر اچھی طرح لپ اسٹک صاف کر دی۔ وہ بڑی مشکل سے صاف

مجھے پرو فیسر ڈینی نہ کہا، صرف ڈینی کہا۔“ پرو فیسر ڈینی نے بنتے درختان نے فوراً اپنا ہاتھ کٹھنگ لیا اور کافی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بولی۔ ”کافی لیں، تھنڈی ہو رہی ہے۔“

”اصل میں تھنے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ تھنے کی قیمت تو تھنے وصول کرنے والا تعین کرتا ہے۔ ایک ڈالر کی حقیرتی چیز ایک لاکھ ڈالر کی بن سکتی ہے اور ایک لاکھ ڈالر کی چیز ایک ڈالر کی بوسکتی ہے۔ آپ نے اس حقیرت سے تھنے کو فوراً استعمال کر کے لاکھوں کا ہنا دیا ہے۔ اس پڑیرائی پر میں تھے دل سے آپ کا مشکور ہوں۔“

”اچھا بس، بہت ادا ہو گیا شکریہ۔“ درختان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے ڈینی آپ کو یہ سوچھی کیا؟“ ”ایک مرتبہ میں اور آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے

وہ اسے بہت پیار بھرے لجھ میں جواب دیتی۔ دیکھ گل افشاں تو مجھے اس قدر محبت بھرے خط نہ لکھا کر۔ میرا جی اچارٹ ہو جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں جس کام کے لیے آئی ہوں وہ کر کے ہی جاؤں لیکن لگتا ہے تیرے خطوط مجھے کہیں کافی چھوڑیں گے۔ میری پیاری بہن، تھوڑا اصر کر لے۔ درخشاں اپنے خطوط میں پرو فیبر ڈینی کا ذکر ضرور کیا کرتی تھی۔ جواب میں اب گل افشاں اسے چھیرنے لگی تھی، لیکن وہ ہر بار بڑی سختی سے اس کے خدشات کی تردید کر دیتی تھی۔ اری، پاگل ہوئی ہے کیا۔ یہ عشق و شق تجھے ہی مبارک ہوں، میں ان فضولیات کی ستمان نہیں ہو سکتی۔ میں یہاں کام کرنے آئی ہوں۔ میرا دماغ ہمہ وقت کام کی طرف رہتا ہے۔ انشاء اللہ کام تکمیل کر کے جیسی تیرے پاس سے آئی تھی، دیکھی ہی تیرے پاس پہنچ جاؤں گی۔

ہوئی۔ رنگ کچھ زیادہ ہی گہرا چڑھ گیا تھا۔ پھر وہ لیب میں واپس آ کر گل افشاں کو خط لکھنے لگی۔ گل افشاں کے خط بڑی پابندی سے اس کے پاس آتے تھے۔ اب خطوط میں بڑی محبت ہوتی تھی۔ وہ اسے بڑی شدت سے یاد کرتی تھی۔ ہائے با جی، اب تہ شاپنگ کا مزہ رہا ہے نہ پنک کا۔ تقریبات میں بھی اکیلی ٹوٹھی ٹیٹھی رہتی ہوں۔ با جی، تو میری کمپنی تھی۔ تجھے امریکیوں نے چھین لیا۔ یہ گورے لوگ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں آخر۔ گل افشاں کا خط آتا تو وہ اداں ہوئے بنانہ رہتی تھی پہ اختیار اس کا جی چاہتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی چھوٹی بہن کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے بغیر وہ خود کو بعض اوقات ادھورا سما محسوس کرتی۔ ایک خلا اس کی زندگی میں ابھر آتا۔

اس کی دی ہوئی لپ اسٹک استعمال کیوں نہ کی۔

آخر یہ سب کیسے ہوا۔ اس نے اس کے بے قیمت تھنے کو اس قدر
تینیتی کیوں بنادیا۔

خط بند کرے وہ بہت دیر تک اس مسئلے پر غور کرتی رہی، لیکن

اس کی سمجھی میں کچھ نہ آیا۔ اس جذبے کو وہ کوئی نام دیتے ہوئے
ڈرتی۔

عشق اس کے نزد یک دماغ کے خلل سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا
تھا۔ اس کا خیال تھا کہ محبت صرف ایب نارمل لوگ کرتے ہیں اور وہ
نارمل رہتا چاہتی تھی۔

آج جب وہ خط لکھنے پڑی تو ڈینی کے تھنے سے متعلق تمام

جزئیات بیان کردیں، لیکن ڈینی کے سامنے لپ اسٹک استعمال
کرنے والی بات بڑی صفائی سے گول کر گئی۔ اگر اسے یہ معلوم ہو

جاتا کہ اس نے ایک گورے کی دی ہوئی لپ اسٹک کو بڑے چاؤ سے

استعمال کیا ہے تو وہ خط ملتے ہی پہلی فلاٹ سے روپالور لے کر امریکا
پہنچ جاتی۔ آخر یا جی، ہم سے اچھا تو وہ گورا ہی رہا۔ ہم پوری زندگی

تیری خوشابدیں کر کر کے تھیں، لیکن تیرے کاں پر جوں تک نہ
رینگنگی اور اس گورے کی دی ہوئی لپ اسٹک فوراً ہوتوں پر تھوپ لی۔

دیے یہ بات اس کے لیے بھی باعث حیرت تھی۔

اسے کیا ہو گیا تھا کہ لپ اسٹک کو استعمال کرنے میں اس دقت
غایل سے کام لیا۔ اس نے لپ اسٹک دی تھی تو لے کر پس میں ڈال
لیتی۔ بعد میں کہیں اٹھا کر پہنچ دیتی۔ وہ پلٹ کر ہر گز نہ پوچھتا کہ

باوجودجاتے ہوئے فاتحہ درختان سے واپسی کا وقت ضرور معلوم کرتی تھی۔ ایسا شاز ہی ہوتا تھا کہ وہ وقت مقرر وہ سے پہلے آجائے۔ اگر آجائی تو فاخرہ کچھ اس انداز سے سوال کرتی کہ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے قبل از وقت آ کر اس نے بھابی کو کوئی بڑا انتصان پہنچا دیا ہے۔ اگر وہ دیر سے آتی تو وہ سرسری سا پوچھ کر وہ جاتی جیسے اس فے دیر سے آ کر برانتہ کیا ہو۔

یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ کھانا کھاتی اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتی۔ اخبار یا کوئی میگزین پڑھنے کے لیے اٹھاتی۔ پھر پڑھتے پڑھتے اسے نیند آ جاتی۔ لیشته وقت وہ کمرے کا دروازہ کھسپی بند نہیں کرتی تھی، جب وہ سوکر اٹھتی تو اکثر اس کے کمرے کا دروازہ بند ملتا۔

فاخرہ پھر خود ہی بتا بھی دیتی کہ دروازہ اس نے بند کر دیا تھا کہ وہ

بہر حال، اس دن وہ بہت خوش تھی۔ گھر میں داخل ہوئی تو اس کا جی چاپا کہ وہ بھابی کے گلے میں بانہیں ڈال کر تجوہل جائے۔ آج وہ ان سے والکن پر خوشی کی دھنیں نہ لیکن اس نے کسی طرح اپنے حذبات پر قابو پالیا۔ بھابی کے سامنے ایسا کرنا بہت ضروری تھا۔ دیے وہ جب سے یہاں آئی تھی بھابی کی رویے میں ایک عجیب تی بات محسوس کر رہی تھی اور اس احساس کے پیچھے کوئی محسوس وجہ بھی نہ تھی۔ بس ایک واہمہ ساتھا۔

اس کا خیال تھا کہ جیسے بھابی اس کی یہاں آمد سے خوش نہ ہوں۔ دیے وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی، کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں فاخرہ کے چہرے سے یہ گمان ہوتا کہ وہ درختان کے یہاں رہنے سے خوش نہیں ہے۔

یونیورسٹی آنے جانے کا بڑی حد تک وقت مقرر تھا۔ اس کے

تحا۔ اسے کچھ بہکاہ کا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا، آج یونیورسٹی سے چھٹی کر لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی طبیعت مزید خراب ہو جائے۔ وہ پچھلے دنوں کافی محنت کرتی رہی تھی، دن رات کام کی وجہ سے شاید وہ اعصابی تحریکن کا شکار ہو گئی تھی۔ آج وہ آرام کرے گی تو اس کے اعصاب کو سکون مل جائے گا۔

اس نے گھری کی طرف دیکھا، آٹھ نجگر ہے تھے، بھیا کب کے دفتر جا پکے تھے۔ اس نے سوچا، ایک گھنٹا اور آرام کر لے نویجے اٹھے گی پھر ناشتا وغیرہ کر کے دوبارہ لیٹ جائے گی۔ یہ سوچ کر اس نے کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی، لیکن درد کی

شدت نے اسے سونے نہ دیا۔

ابھی وہ سونے کے لیے کروٹیں ہی بدل رہی تھی کہ فاخرہ کرے ایک دن وہ حصہ سوکرائی تھی تو اس کا سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا میں داخل ہوئی اور اسے کمبل میں لپٹا دیکھ کر اس کی طرف تیزی سے

اطمینان سے سو سکے، کیونکہ وہ ایک نئی دھن نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کبھی ایسا بتا کہ جب وہ سوکرائی تھی تو دروازہ کھول کر باہر آ جاتی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ بھابی کیا کر رہی ہے وہ اس کے بیڈ رومن میں چلی جاتی تو وہ فاخرہ کو ٹیکی فون پر بات کرتے ہوئے پاتی۔ وہ بڑے آرام سے لیٹے ہوئے فون پر بات کر رہی ہوتی۔ بات کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا، جیسے کسی دوست کا فون ہے۔ درخشاں کمرے میں داخل ہوتی تو وہ فوراً ٹیکی فون بند کر دیتی اور مسکرا کر درخشاں کا استقبال کرتی۔ ”اٹھ گئی شہزادی۔“

”جی بھابی۔“ وہ نہ سکر کہتی، لیکن اسے احساس ہوتا جیسے وہ اس کے کام میں مخل ہوئی ہے۔

میں داخل ہوئی اور اسے کمبل میں لپٹا دیکھ کر اس کی طرف تیزی سے

کام کا ہرج نہ ہو۔” یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گئی۔

بڑھی۔ ”ارے شہزادی، آج یوں سورشی نہیں جاؤ گی؟“

”دنیس بھائی۔“ درختان بولی۔

کمبل میں منہ لپیٹے وہ سورچتی رہی کہ بھابی اسے گھر سے نکالنے پر

”کیوں؟ خیریت، کل تو تم نے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔“ فاخرہ مشرکوں ہے جبکہ اس نے پچھلے تین چاہ ماہ میں یہ پہلی چھٹی کی تھی۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ آج وہ گھر پر رہ گرا سے کمپنی دے گی۔

”بھابی میر می طبیعتِ نمیک نہیں ہے اور آج ہی خراب ہوئی ہے۔“ پھر وہ اٹھ گئی۔ باٹھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور لیکن میں جا گھسی۔ فاخرہ باور دچھی خانے میں موجود تھی اور برتن دھور ہی تھی۔ سر میں درد اور بخار سا ہے۔“

”ارے تو یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی، میں انھی تھیں ایک گولی اسے دیکھ کر بولی۔“ پہلے کچھ کھا اؤ پھر میں دوادیتی ہوں، جاؤ تم ناشتے دے دیتی ہوں، آگے گھنٹے میں تمہاری طبیعتِ نمیک ہو جائے گی، پھر تم کی میز پر چلو، میں تمہارے لیے ناشتا وہیں لا رہی ہوں۔“

چاہ بتو یوں سورشی چلی جانا۔“

”آپ مجھے دا ضرور دے دیں، لیکن میں آج گھر پر آرام کروں تیار نہ کر سکوں۔“

پھر اس نے ناشتا تیار کیا۔ ناشتا کر کے اس نے اپنے اور فاخرہ ”جیسی تمہاری مرضی۔ میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تمہارے کے لیے کافی بنائی۔ دس پندرہ منٹ فاخرہ سے گپ شپ کی پھر اس

”آج نہیں، کل تم مجھے دس بجے کے بعد ٹیا فون کر لینا۔ نہیں

سے گولی لے کر کھائی۔

”اچھا بھائی میں اب چلتی ہوں اپنے کمرے میں۔“ وہ اشتنے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ فاخرہ کوئی جواب دیتی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ تیر کی طرح ٹیلی فون کی طرف گئی۔

”ہیلو اچھا، ایک منٹ ہولڈ کرو۔“ اس نے انگریزی میں کہا۔ پھر وہ رسیور رکھ کر دروازے تک آئی۔ یا ہر درختاں میں وجود نہ تھی۔ وہ سمجھی کہ اپنے کمرے میں چل گئی ہو گی حالانکہ اس وقت وہ کچن میں تھی۔ اپنے لیے ایک گلاس پانی نکال رہی تھی تاکہ اپنے سرہانے رکھ سکے۔ فاخرہ واپس پڑی، اس نے رسیور اٹھایا اور بولی۔

”سنؤ، آج وہ گھر پر ہے، یونیورسٹی نہیں جا رہی۔“
اپنا ذکر سن کر درختاں دروازے پر رک گئی۔

ہے او کے۔“

ٹیلی فون پر گفتگو ختم ہوتے سن کر درختاں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ سائیڈ نیسل پر گلاس رکھا اور جلدی سے کمبل اڈڑھ لیا۔ یہ فاخرہ کس کو اس کے بارے میں بتا رہی تھی۔ کون ہے وہ؟ یہ کیا چکر ہے۔ اب اس کی سمجھی میں کچھ کچھ آنے لگا۔ آج بھائی اس کے گھر پر رہنے کی وجہ سے خوش کیوں نہیں ہوئی۔ شاید کہیں جانے کا پروگرام تھا، کسی سے مانشے کا وعدہ تھا، لیکن اس نے گھر برہ کر سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔

کیا اسے فاخرہ سے اس موضوع پر بات کرنا چاہئے۔ نہیں، وہ کوئی بات نہیں کرے گی۔ سانپ بل میں داخل ہو جائے تو اسے دم سے پکڑ کر کبھی نہیں کھینچتا چاہئے۔ اس طرح وہ کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ اس کے بل

”ارے ان کافون کیسے آگیا؟“ پھر اس نے بھاگ کر میسور

سے نکلنے کا انتظار کرنا چاہئے۔ سو وہ مناسب وقت کا انتظار کرے گی۔

اس گولی سے واقعی اسے آرام آگیا۔ سر کا درد بھی ختم ہو گیا اور بخار اٹھایا۔

”ہیلو، ذرخشاں بول رہی ہوں۔“

کیسی کیفیت بھی درد ہو گئی۔ سکون مالتو اسے نیندا آگئی۔

”ہاں کیا ہوا آپ کو آج یونیورسٹی نہیں آئیں۔“

کوئی گیارہ بجے کے قریب فاخرہ نے اسے اٹھایا۔ ”ذرخشاں تھبہار انہوں ہے۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ اس نے پوچھا۔

”میراںوں!“ اس نے اپنے اوپر سے کبل ہٹاتے ہوئے کہا۔

”جب ربطہ گبرا ہو جائے تو پھر سب کچھ خود بخوب معلوم ہونے لگتا ہے۔“ ڈینی نے فلسفہ جھاڑا۔

”ہاں ہاں تھبہار انہوں ہے۔“

”گویا پادری ہو گئے۔“ اس نے بس کر کہا۔

”میراںوں کہاں سے آگیا؟“ اس نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اب کیا حال ہے، کیسی طبیعت ہے، کیا ہوا تھا؟“ کئی سوالات ایک ساتھ ہوئے۔

”مجھے کون میاں فون کر سکتا ہے؟“

”دو ہیں۔“ فاخرہ نے آنکھیں چکاتے ہوئے کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، ذرا سر میں درد تھا اور کچھ بخار کی سی کیفیت تھی۔ آپ کوڈاکٹر براؤن سے پتا چلا ہوگا۔ میں نے صحیح انہیں

”وہ کون؟“ ذرخشاں حیران تھی۔

”تھبہار سے پروفیسر ڈینی۔“ فاخرہ مسکرا کر بولی۔

گی، ”تم تنہائی میں اطمینان سے با تم کر لیتا۔“ فاخرہ نے بڑی

فون کر دیا تھا۔“

”جی جناب“ مجھے انہوں نے ہی بتایا، کیا میں آپ کو دیکھنے آ سکتے فرائد لائے پیش کی۔

اسے یہ سن کر غصہ آگیا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کا سردیوار سے

ہوں؟“ ادھر شوق دیدار تھا۔

دے مارا ہو۔ ایک دھماکہ سا ہوا تھا اور اسے اپنے سر میں شعلے سے
بھرے محسوس ہوئے تھے۔

”ضرور آئیں، مجھے خوشی ہو گی۔“ ادھر بھی کوئی پذھاری دبی ہوئی تھی۔

”جی شکریہ بھائی، آپ پورے اطمینان سے گھر میں رہیں بلکہ جب پر و فیر ڈینی آ جائیں تو آپ ہمارے ساتھ بیٹھیں۔ میرے اور ان کے درمیان تعلقات آئینے کی طرح صاف ہیں۔“

”اوکے باتی۔“ درختاں نے ٹیلی فون بند کیا اور فاخرہ کی آنکھوں بولا۔

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھرائے تھے۔ اس نے انہیں آنسو بھری آنکھوں سے بھائی کو دیکھا اور اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر اونڈھے منہ جا گر کی اور سکنے لگی۔

”اوکے باتی۔“ درختاں نے ٹیلی فون بند کیا اور فاخرہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”آرہے ہیں؟“ وہ بولی۔ ”کب تک آئیں گے؟“

”تین بجے تک آئیں گے۔“ درختاں نے سادگی سے کہا۔

یہ بھائی نے اسے کیا سمجھ لیا ہے۔ امریکا میں رہ کر تو ان کی عادتیں

”ٹھیک ہے، اس وقت میں ایک دو گھنٹے کے لیے باہر چلی جاؤں

بی بدل گئی ہیں۔ انہوں نے ڈینی اور میرے درمیان آخر ایسا کیا دیکھا ”فارخہ نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔
”لیکن بھائی، ایسا گند انداق مجھے ہرگز پسند نہیں، براہ کرم آئندہ تھے
کہ اتی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ ٹھیک ہے، میں ابھی ٹھیک
کریں۔“ وہ دوٹوک لپجھ میں یوں۔

”اچھا بابا، تمیں کروں گی۔ چلو، میں معدودت کر لیتی ہوں۔“
فارخہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کبھا۔ ”اب تم پروفیسر کو گھر آنے
سے منع نہیں کرو گی، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے ہوئے بولی۔ آپ اپنا
ذہن میری طرف سے بالکل صاف کر لیجئے۔ میں زر ا مختلف قسم کی
لڑکی ہوں۔ میں یہاں پاکستان کا نام اچھا لانے نہیں آئی، روشن کرنے
آئی ہوں۔“

فارخہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ دریکرے میں
کھڑی رہی۔ پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

وہ اٹھ کر باہر جانے لگی تو فارخہ دروازے میں سے اندر داخل ہوئی
اسے باہر جاتے دیکھ کر بولی۔ ”کہاں جا رہی ہوں درختاں؟“
”پروفیسر ڈینی کو نہ کرنے جا رہی ہوں۔“ اس نے بے رخی سے
”کیوں؟“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔
”میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں آئیں، کم از کم میرے لیے درختاں
نے بتایا۔“

”بے وقوفی کی باتیں نہیں کرتے، تم نے میرے مذاق کو شاید
تجید گی سے لے لیا ہے۔ نند بھادوں میں آخر اتنا مذاق تو چلتا ہی ہے۔“

لیکن خواب میں میں ایسی بات نہ کہوں گی۔ ” درخشاں نے بھی

پھر اس بات کو دو تین بفتے گز رگئے۔

پروفیسر ڈینی کے سینے میں جو شمع محبت روشن ہوئی تھی، اس کی روشنی صاف گوئی سے کام لیا۔

” میں جانتا ہوں، میں بہت بد قسم انسان ہوں۔ ” وہ اداس ہو

نے اب درخشاں کو اپنی پیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک دن اس نے وہ

بات کہہ دی جس کی توقع درخشاں کو تھی، لیکن وہ اس بات کو سننا نہیں گیا۔

” پروفیسر ڈینی، تم الگ الگ دوسیارے ہیں جو اپنی ایک

چاہتی تھی۔

جدا گانہ دنیا رکھتے ہیں۔ آپ میری تمنا کرنا چھوڑ دیں۔ ”

پروفیسر ڈینی درخشاں میں بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس شام تھیز

” تم میتی دنیا کا چند ہو۔ ” وہ بولا۔

سے نکلتے ہوئے اس نے درخشاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور

کہا تھا۔ ” تم وہ لڑکی ہو جس کا مجھے صدیوں سے انتظار تھا۔ ”

” ہاں ایسا چاند جسے آپ دور سے دیکھ سکتے ہیں۔ ” اس نے ہنس

درخشاں نے بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا

تھا اور مسکرا کر کہا تھا۔ ” کیوں مجھے بے وقوف بناتے ہیں۔ ”

” میں چاند پر چلا جاؤں گا۔ اپنی دنیا چھوڑ دوں گا۔ ” ڈینی نے

” میں چ کہتا ہوں، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ ” اس نے صاف

فیصلہ سنایا۔

” وہ کیسے؟ چاند پر جانا اتنا آسان کہا؟ ” اس نے وضاحت

لیجہ اختیار کیا۔

احتراء کرو، تم شادی شدہ آدمی ہو۔ تمہاری بیوی نیو یارک کے نواحی چاہی۔

”میں مسلمان ہو جاؤں گا“ تمہاری زبان سیکھ لاؤں گا۔“

میں ایک چھوٹے سے گھر میں تمہاری منتظر ہے۔ تم اس کے لیے واپس جب اس نے یہ بات سنی تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس کے مقابل اوت جاؤ، وہ تمہاری دنیا کی عورت ہے۔ ہم رنگ، تم تہذیب، میں ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں جھماونکا۔ اس کی آنکھوں میں سچائی کے دیے مرغخ کی مخلوق ہوں، میں نہ تمہاری دنیا میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں روشن تھے۔ وہ بے قراری سے بولی۔ ”ذینی تم اتنے سنجیدہ ہو مجھ میں۔ اور نہ ہی اپنے ساتھ تمہیں لے جاسکتی ہوں۔ یہ میرا آخری اور اٹل اپنا اٹل، اپنا ذہب، اپنی زبان سب چھوڑ دو گے۔“

”ہاں میں اتنا ہی سنجیدہ ہوں۔“ اس نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں ہے، میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو گاڑی کس طرف کھڑی ہے؟“

پھر وہ شام ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ اب کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ دونوں ہی اپنی باتیں بڑے صاف لفظوں میں کہہ چکے تھے۔

شاید وہ سب سن کر ہواؤں میں اڑ رہی ہوتی اور یہ بات ہے بھی اڑ کی کے لیے تابل فخر، لیکن میں بہت حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ جذبات میں بہنا مجھے نہیں آتا اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی جذباتی فیصلے سے

بینڈسم خصیت پاکستان میں اگر اس کی دوست دیکھتیں تو دانتوں تے انگلی دبا کر رہ جاتیں۔ پھر گل افشاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس نے اپنی حماقت سے ایک اچھا شخص کھو دیا ہے تو وہ اسے کیا کیا نہ کہے گی۔ بس انہی خیالات میں غلط اسحر بوجئی، لیکن اس سے نہ اٹھا گیا۔

سر میں شدید درد تھا۔ انگلیوں میں جلن ہو رہی تھی۔ باہر سے کھٹ پٹ تحریب میں تیر چھپی ہے۔ بالآخر ڈینی اپنی بھوولی ہوئی بیوی کی طرف اوت جائے گا، جو دل اس نے توڑا ہے وہ اس کی بیوی جوڑ دے گی کرنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں، کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

بابر بلال کے جانے کے بعد نافرہ نے درخشاں کے کمرے میں جھانکا اسے سوتا ہوا سمجھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور کمی کو ٹیکن فون کرنے لگی۔

درخشاں نے اسے دروازہ بند کرتے دیکھ لیا تھا، وہ سوکب رہی تھی۔ اس کی پوری رات آنکھوں میں کوئی تھی۔ دروازہ بند ہوتے ہی

اس رات درخشاں سونے لگی۔ رورہ کرا سے ڈینی کا خیال آتا رہا۔ اس نے اس کی محبت کو بڑی بے دردی سے منکرایا تھا، لیکن اس کے سوا کوئی چاروں بھی نہ تھا۔ اگر وہ دوڑوک انداز اختیار نہ کرتی تو شاید وہ ڈینی کی محبت سے کبھی نجات نہ پا سکتی۔

اس نے ایک محبت بھر ادل توڑا تھا، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس تحریب میں تیر چھپی ہے۔ بالآخر ڈینی اپنی بھوولی ہوئی بیوی کی طرف اوت جائے گا، جو دل اس نے توڑا ہے وہ اس کی بیوی جوڑ دے گی اور ایک مشرقی لڑکی کا یہ احسان کبھی نہ بھولے گی۔

شاید آج ڈینی سے اس کی آخری ملاقاتات تھیں۔ وہ بڑا انداز پست شخص تھا، اب شاید اس کی طرف اوت کرنہ آئے۔ پھر اس کے دل نے پلانا کھایا۔ پچھتاوا اشروع ہوا۔ ہائے، اس نے خواہ غواہ اسے منکر دیا۔ اس کے لیے تو وہ اپناند ہب، اپنا ملک سب کچھ چھوڑ رہا تھا۔ ایسی

درخشاں فوراً اٹھی۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے کھولا اور باہر آگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹیلی فون رکھ کر باہر آتی، درخشاں بھاگ کر فاخرہ بڑے اطمینان سے بیڈ پر بیٹھی، گود میں ٹیلی فون رکھے کسی سے مونگنگ تو تھی۔ اسے درخشاں کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ آٹھ بجے آٹھتی تھی اور ابھی آٹھ بجے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔

تحوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کا دروازہ کھل گیا ہے کیونکہ فاخرہ کے گنگنا نے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں واکر کے دیکھا، دروازہ کھول دیا گیا تھا۔

اب دروازہ بند کرنے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی تھی بھلا۔ پھر وہ وقت مقررہ پر اٹھ گئی۔ با تھر روم میں جا کر دانت برش کرتے ہوئے اس نے اپنی شکل پر نظر ڈالی۔ وحشت برس رہی تھی۔ رات بھر جانے کے تمام آثار اس کے چہرے پر موجود تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کچھ سوچ بھی رہی تھیں۔ چہرہ کملایا ہوا تھا۔ رنگ بھی پھیکا پھیکا ہو رہا تھا۔

اپنے کرے میں پہنچی دروازہ بند کیا اور چھلانگ مار کر بستر میں گس گئی۔ اسے درخشاں کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ آٹھ بجے درخشاں دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اس کی گفتگو سننے لگی۔ ”ہاں پھر بتاؤ“ تم کتنے بجے تک آؤ گے۔ گیارہ بجے تک، تھیک ہے، تم آؤ گے تو میں ایک چیز دکھاؤں گی۔ نہیں، ابھی نہیں بتاؤں گی۔ اچھا چلو، بتاؤ میں میں نے تمہاری تصویر مکمل کر لی ہے۔ بڑی مشکل سے ہوئی ہے۔ بھی یہ کام چھپا کر کرنا ہوتا تھا۔ دیے بھی میں نے تمہیں ساری دنیا سے چھپا کر اپنی آنکھوں میں بسار کھا ہے۔ مانتے ہو نا اس بات کو۔ اچھا، چلو باقی یا تیس ملاقات پر۔ میں گیارہ بجے تمہارا انتظار کروں گی اور کے ڈسیر بائی۔“

کر دیتیں۔

سوچتے سوچتے اسے یہ احساس نہ رہا کہ وہ کتنی دیر سے دانتوں کو برش کیے جا رہی ہے۔ اچانک اسے بوش آیا۔ پھر وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔

”ہائے شہزادی۔“ فاخرہ نے اسے باتحروم سے نکلتے دیکھ کر وہ کیا۔ وہ اسے پیار سے شہزادی ہی کہتی تھی، درخشاں کو اس کا شہزادی کہنا اچھا لگتا تھا، لیکن آج اچھا نہ لگا۔ جواب میں وہ چیلکی تی بنس دی۔

”ارے، آج تو تم نے باتحروم میں بڑی دیر لگا دی۔ کیا کر رہی تھیں وہاں؟“ فاخرہ نے ہستے ہوئے کہا۔

”وہاں کیا ہو سکتا ہے منہ ہاتھ دھور ہی تھی۔“ اسے فاخرہ کی بُنس زہر لگی۔

”اور یہ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟“ ”پتا نہیں،

دانت برش کرتے ہوئے وہ ڈینی کے بارے میں سوچتی رہی۔

رات گزرنے کے بعد وہ اپنے اس فنیلے پر قائم تھی کی اس نے جو کچھ کیا تھا، ٹھیک کیا تھا۔

پھر وہ کاڑ ہن فاخرہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تو اس کا شہر ٹھیک ہی تھا۔ کوئی ہے جو اس کی تغیر مذہبی میں یہاں آتا جاتا ہے۔ جانے کب سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ جانے کب سے بھائی بھیا کو بے وقوف بنارہی ہے۔ بہر حال آج معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون ہے۔ اصل میں جو بیسا ہوتا ہے، اس کی سوچ بھی اس کے کردار کے مطابق ہوتی ہے۔ بھائی نے اسے ڈینی سے تباہی میں ملنے کی جو لائن دی تھی وہ انکے ذہن کی عکاس تھی۔ انہوں نے اسے بھی اپنے جیسا سمجھ لیا تھا یا اسے ڈھیل دے کر اپنے لیے آسانی پیدا کر رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس تباہی کی ملاقات کے بعد اسے بالیک میل کرنا شروع

نے کوئی قلم نہیں دیکھی۔

”پھر تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہیں؟“ سوال ہوا۔

”رات کو تھیک سے نیند نہیں آئی، پار بار آنکھ کھلتی رہی۔“ جواب

ملا۔

”جلو، کوئی بات نہیں، کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔“ فاخرہ جلدی سے انکھ کھڑی ہوئی اور اس سے بولی۔ میں تمہارے لیے ناشتا بنادیتی

ہوں، تم تب تک ڈریس تبدیل کرو۔ کہیں تمہیں دیرتہ ہو جائے۔“

اسے فکر ہو گئی تھی کہ یہ رات بھر سوتی نہیں ہے، کہیں ایسا نہ ہو یونیورسٹی سے چھٹی کر لے۔ درختان کی آج حالت بھی ایسی ہی تھی،

اگر اس نے فون پر گفتگو نہ سی بوتی تو وہ ضرور چھٹی کر لیتی، لیکن اب تو اسے یونیورسٹی کے بہانے ہر قیمت پر گھر سے نکلنا تھا۔

”بھائی، میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے، آنکھیں بھی جل رہی

آپ نے ناشتا کر لیا؟“ اس نے پوچھا۔

”آدھا بابر کے ساتھ کر لیا، آدھا تمہارے ساتھ کروں گی۔“ اس نے خوشگوار لمحے میں کہا۔ وہ زیر دستی مسکرائے جا رہی تھی۔ اٹھا رہی تھی۔ درختان جانتی تھی کہ اس خوشی کے پیچھے کی راز ہے؟

”درختان، تمہارا چہرہ بھی کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ مج بتاؤ کیا ہوا؟“ تم رات کو سوئی پہوچانہیں۔ رات کو تم نے کوئی ہی ور فلم تو نہیں دیکھی۔ میں تمہارے اس شوق سے بڑی تنگ ہوں۔ تمہیں کیا مزہ آتا ہے ان خوفناک قلموں کو دیکھ کر۔ پھر رات بھر ڈر کی وجہ سے سو نہیں سکتیں۔

بھائی، آپ اپنے شوق تو دیکھیں۔ آپ کو کیا مزہ آتا ہے کسی غیر مرد سے مل کر جبلکہ اللہ نے آپ کو ایک ہیڈسم شوہر عطا کیا ہوا ہے۔ یہ بات اس نے سوچی مگر کہہ نہ سکی، کہا تو صرف اتنا۔ ”نہیں بھائی، میں

”ہاں اچھایا درلا دیا آپ نے، آج تو میں کسی قیمت پر چھٹی نہیں کر سکتی۔ اگر یونیورسٹی اسٹریپر جانا پڑے تو جاؤں گی، آج اصل میں میری ڈاکٹر براون سے مینگ ہے جو کام میں نے اب تک کیا ہے، اس کا جائزہ لیا جانا ہے اور شاید آج مجھے آنے میں دیری بھی ہو جائے۔“
یہ کہہ کر درختاں نے بطور خاص فاخرہ کا چہرہ دیکھا۔ وہاں اداسی کی چکے خوشی نے لے لی تھی۔ مرکار عوزت۔ اس نے سوچا۔

”مینگ کتنے بچے ہے؟“ فاخرہ نے پوچھا۔

”عمیارہ بچے۔“ درختاں نے حقیقت بیان کی، لیکن فاخرہ نہ کہجھی۔

”بس تو پھر نوبچے جانے کی کیا ضرورت ہے، تم وہ بچے لکھنا، میں تمہارے سر میں تیل لگا کر ماش کیے دیتی ہوں، تم پھر تیز پانی کا شاور لے لو۔ پھر اپنی پستہ کا ناشتا کرو، گرم گرم کافی پکو، فریش ہو جاؤ میں تمہارا ابھی مُھیک کر دوں گی، تمہارے سر میں ماش کر کے۔

ہیں، سوچ رہی ہوں، آج یونیورسٹی نہ جاؤں۔“
تب ہی کچن میں چھنا کا ہوا۔ فاخرہ کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر فرش پر گرا۔ وہ فوراً کچن میں پیچی۔

”کیا ہوا بھابی؟“ اس نے بڑی مخصوصیت سے پوچھا۔
”کچھ نہیں۔“ فاخرہ نے اپنے کوسنہا لئتے ہوئے کہا۔ ”گلاس ہاتھ سے ساپ ہو گیا۔“

”ٹولے ہوئے مکڑے احتیاط سے سیمیں، کہیں ہاتھ لبولہاں نہ ہو جائے۔“ درختاں بولی۔

”نہیں، ایسا نہیں بوجا۔“ فاخرہ کا بچ کے نکڑوں کو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارا یونیورسٹی جانے کا پروگرام نہیں ہے تو شہ جاؤ،“ لیکن دیکھا، کہیں تمہارے کام کا ہر جس ہو، دردو میں تمہارا ابھی مُھیک کر دوں گی، تمہارے سر میں ماش کر کے۔

اور جاؤ۔“

”بہت اچھے۔“ درختان نے تالی بجائی۔ ”بہت زبردست پروگرام ہے۔ بس پھر شروع ہو جائیے۔“

”لاڈ“ تیل اٹھا کر لاڈ۔“ فاخرہ نے بڑی محبت سے کہا۔

فاخرہ ماش بہت اچھی کرتی تھی۔ اتنی اچھی کہ آدمی کو نیند آنے لگتی تھی۔ وہ اکثر اس کے سامنے تیل کی شیشی لے کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

”بھابی، آج بھیا کتنے بچے گئے؟“ درختان آنکھیں بند کیے بولی۔

”وہی ساروں سات بچے حسب معمول۔“ فاخرہ نے کہا۔

”کیوں پوچھ رہی ہو تم؟“

”میں سوچ رہی تھی کہ ہمارے بھیا کی کوئی لاٹ نہیں، صبح کے گئے ہوئے رات کو آتے ہیں۔ گھر میں آ کر کچھ دیر مجھ سے بات کریں“

کچھ آپ سے گفتگو فرمائی۔ موڈ ہوا توئی وی دیکھ لیا یا میوزک سن لیا، درنہ کوئی ڈا جسٹ اٹھا کر بیٹھ گئے اور دس بجتے ہی بیدروم کا رخ کیا۔ ان کا ویک اینڈ بھی گھر پر ہی گز رتا ہے یا کبھی میں اور آپ انہیں تھیز دیکھنے کے لیے پکڑ کر لے جاتے ہیں، یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ آفس اور گھر۔ انہیں معلوم ہی نہیں، دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ویسے وہ پاکستان میں تو ایسے نہ تھے۔ ہم لوگ جس دن پا بر بھیا کو گھر پر دیکھ لیتے، اس دن ہماری غید ہو جاتی، کہاں وہ اتنا گھونٹے پھرنے والے تھے اور کہاں اب وہ کوئی گھوکے بیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک بندھی نگلی لاٹ۔“ وہ بہت سیدھے ہیں بے چارے۔“

”اب اتنے سیدھے بھی نہیں ہیں، جتنا تم سمجھ رہی ہو۔“ ”نہیں بھائی، وہ بہت سیدھے ہیں، وہ امریکا میں رہتے ہیں لیکن امریکا جیسی ان میں کوئی بات نہیں، شراب وہ نہیں پیتے، نائٹ کلبوں

کر رہی تھی۔“

سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں اور.....” اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اچھا بھائی یہ بتا نہیں یہ صرف مرد ہی خراب ہوتے ہیں یا

”یہ بات تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟“

عورتیں بھی ہوتی ہیں۔“

”وہ میرے بھائی ہیں، میرا خون ہیں، میں انہیں چھپی طرح جانتی

عورتوں کو خراب کرنے والے بھی یہی مرد ہیں۔“ فاخرہ نے

ہوں۔“ درخشاں نے بڑے وثوق سے کہا۔

جواب دیا۔

”بے وقوف“ صبح سے رات تک باہر رہتے ہیں، میں یا تم کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہ دفتر جاتے ہیں یا کسی اڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ درخشاں تو ابھی ان مردوں کو نہیں جانتی۔“

”تو گویا فساد کی جڑ یہی مرد ہیں؟“ درخشاں بولی۔

”آپ جانتی ہیں ان مردوں کو؟“ درخشاں نے چنگی لی۔

”ہاں تو اور کیا۔“ فاخرہ نے کہا۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔“

”اچھا چھوڑیں اس بحث کوئی فرماتیں، آپ کبھی آئینہ بھی دیکھتی ہیں۔“

”میرے ہیرے جیسے بھائی کے یارے میں آپ اتنی خراب رائے رکھتی ہیں، یہ جان کر مجھے افسوس ہوا۔“

”روز ہی دیکھتی ہوں۔“ فاخرہ نے کہا۔

”آج بھی دیکھا تھا؟“ درخشاں نے پوچھا۔

”ہاں، آج بھی دیکھا تھا۔ میں کوئی تمہاری طرح تھوڑا اسی ہوں

”ارے تم سے تو کوئی بات کرنا مشکل ہے، میں تو ایک عام بات

جسے آئینہ دیکھنے مہینوں ہو جاتے ہیں، درختان تم جیسی اڑ کی شایدی ہی وضاحت چاہی۔

اس دنیا میں کوئی اور بھو۔ حد ہے بے پرواںی کی۔ اس طرح بھی کوئی اپنے آپ سے بیگانہ ہوتا ہے۔

”لیکن آپ نے ان پر کوئی از امتوں نہیں وگایا، محض خیال آرائی کر رہی تھیں، مردوں کی فطرت بیان کر رہی تھیں، پھر میں کیوں برآںوں۔“

”اچھا، اب ختم کریں ماش، آپ بہت اچھی ماش کرتی ہیں۔“

واقعی میرے سر کا درد کم ہو گیا۔ آنکھوں میں بھی تراوٹ آگئی اور بھوک بھی لگنے لگی۔ میں اب جاتی ہوں نہ بانے۔ آپ ناشتا تیار کریں۔ پھر میں بھاگوں یونیورسٹی۔“ درختان امتحنے ہوئے بولی۔ تاکہ آگے بات کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

جب وہ نہیا کر باہر آئی تو فاخترہ نے اسے دیکھ کر ناشتا میز پر چین دیا اور بڑی ملامت سے بولی۔ ”شہزادی، تم نے میری بات کو برآ تو نہیں مانا۔“

”آپ کا اشارہ بامبر بھیا کے متعلق ہے؟“ درختان نے ہے۔ انہوں نے اگر امریکا میں رہتے ہوئے یہاں کی معاشرت کو

نہیں اپنایا ہے تو میں بھی یہاں امریکی بیوی کی طرح نہیں رہتی۔ میں دروازے تک چھوڑنے آئی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ سیر ہیاں اترتے ایک پاکستانی بیوی کی طرح اپنے شوہر کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی۔ اس ہوئے درختاں نے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ بھابی اتنے گھر سے نکالنے میں کامیاب ہو کر بہت خوش ہو رہی بات کی گواہی تو تم بھی دو گی۔“

ہاں بھابی چند گھنٹے اور تو قف کریں، پھر میں ایسی گواہی دوں گی کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔ دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ امریکہ میں رہ کر کتنا پاکستانی ہیں۔ کتنا وفا شعار ہیں۔ کتنا شوہر کی عزت کو سنبھال کر رکھنے والی ہیں۔ تھہر جائیے، صرف چند گھنٹے تھہر جائیں۔“

”یہ بات اس نے اپنے آپ سے کبی اپنے دل میں کبی۔ یہ بات بلند آواز میں کہنے کا بھی وقت نہیں آیا تھا۔ وہ فاخرہ کی یاتوں پر محفوظ ہوں ہاں کرتی رہی۔“

دس بجے کے قریب اس نے فاخرہ کو خدا حافظ کہا۔ وہ اسے دکھائی دیا۔ بو تھوڑے میں داخل ہو کر اس نے باہر بلال کا ٹیلی فون نمبر اپنے

”خیریت درختاں! تم کچھ گھبرائی آئی ہو، بتاؤ کیا ہوا؟“

”بھیا، بھی تو کچھ نہیں ہوا، لیکن آئندہ ہونے والا ہے اور جو

”میں بابر بلاں سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے انگریزی ہونے والا ہے، اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ درختاں کی آواز میں ارزش تھی۔

”فاخرہ تو ٹھیک ہے؟“ بابر بلاں نے پوچھا۔

”جی، بہت مزے میں ہے آپ کی فاخرہ۔“ درختاں نے کاث دار لمحے میں کہا۔

”پھر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“ بابر بلاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”بھیا، کیا آپ اس وقت گھر آ سکتے ہیں؟“ درختاں نے پوچھا۔

”ہاں، آ سکتا ہوں، لیکن بات کیا ہے؟“

”بھیا، بات میں ٹیکی فون پر نہیں بتا سکتی، آپ بس فوراً گھر

بیک سے نکالا۔ پھر سکر ڈال کر اس نے نمبر ملا یا۔

”ہیلو۔“ ادھر سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

”میں بابر بلاں سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے انگریزی ہونے والا ہے اور جو میں کہا۔

”ہولڈ کیجئے۔“ ادھر سے جواب ملا۔

پھر چند لمحوں بعد ریسیور میں جوآواز آئی وہ بابر بلاں کی تھی۔

”ہیلو۔“

”بھیا، میں درختاں بول رہی ہوں۔“

”کہاں سے بات کر رہی ہوئی نیورٹی سے؟ بابر بلاں نے پوچھا۔

”نہیں بھیا، میں ایک پلک بوتحے سے بات کر رہی ہوں اور گھر کے نزدیک سے ہی بول رہی ہوں۔“

آ جائیں، بتائیں، کتنی دیر میں آ جائیں گے،" اس نے فیصلہ کن انداز جاتی تھی۔ ایک نامعلوم خوف اس پر چھپا جاتا تھا۔ دل کی دھڑکن ایکدم تیز ہو جاتی۔ ہاتھ پاؤں بٹھنڈے ہونے لگتے۔ اختیار کیا۔

دیٹر کے آنے پر اس نے چائے کا آرڈر دیا اور بیگ سے نکال کر اپنے کیے ہوئے نولیں پر نظر ڈالنے لگی۔ وہ انہیں بڑے انہاک سے پڑھ رہی تھی، لیکن ایک لفڑا بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس ایسے ہی ورق ا لٹھے جا رہی تھی۔

چائے آنے پر اس نے پوری اطمینان سے بنائی اور گھونٹ گھونٹ کر کے اسے پینے لگی۔ چائے ختم کر کے جب اس نے وقت دیکھا تو مخفی دس نج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وقت بھر سا گیا ہے۔ تب اس نے ایک کافی کا آرڈر دے دیا اور ساتھ پچھے کھانے کے لیے بھی منگوایا۔

پھر وہ وقت مقررہ پر کیفے سے باہر آئی اور تیز تیز قدموں سے گھر

"آنے میں دو گھنٹے ضرور مل چائیں گے،" اس نے کہا۔ "آنے میں آپ کا شدت سے انتظار کروں گی، اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا اور پلک یو تھے باہر نکل آئی۔ وہ زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

کچھ دور آگے چلی تو اسے ایک کینے دکھائی دے گیا۔ وہ اس میں داخل ہو گئی۔ کیفے تقریباً خالی پڑا تھا۔ اکا دکا آدمی ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دروازے کے تزدیک ہی ایک میز پر بیٹھ گئی۔

اس وقت دس نج کرنیس منٹ ہوئے تھے۔ یہاں اس نے سوا گیارہ بیکھر پہنچنا چاہتی تھی۔ آنے والے وقت کا خیال کر کے اس کے جسم میں سانسی آئی دوڑ

کیونکہ ہمیشہ فاخرہ اسے گھر پر ہی ملتی تھی۔ آج اس کو چاپی کی ضرورت

کی طرف چل دی۔

پڑی تھی اور وہ بھی کس طرح۔

درخشاں ان غافل انسانوں کے سروں پر دبے پاؤں، موت کی طرح پہنچنا چاہتی تھی تاکہ شک کی کوئی گنجائش نہ رہے اور کوئی فرار کا راستہ باقی نہ بچے۔

پہنچنے والا ٹھیک بارہ بجے پہنچ گیا بوجا۔ بو سکتا ہے بے قراری اسے کچھ پہلے ہی لے آئی ہو۔ اب تو وہ بڑے اطمینان سے محو گشتگلو ہوں گے۔ ان کے خیال میں درخشاں تو اس وقت اپنے نگران ڈاکٹر برادر اُن سے میلنگ کر رہی ہو گی۔ پھر ڈر کا ہے کا۔ دھڑ کا کیسا۔

تلے میں چاپی لگانے سے پہلے اس نے چاپی کے سوراخ سے اندر جھانک کا، سامنے کچھ نہ تھا۔ ڈائینگ نیبل کا ایک کونا اور دو کر سیاں نظر آ رہی تھیں، وہ اپنے کمرے میں ہوں گے شاید۔

جب وہ بلڈنگ کے احاطے میں داخل ہوئی تو ٹھیک ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا اندازہ تھا کہ باہر بلاں بارہ بجے تک گھر پہنچیں گے۔ تب تک اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

سیرہ بھیاں چڑھتے ہوئے اس نے بیگ سے فلیٹ کی چاپی نکال لی، یہ وہ چاپی تھی جو باہر بلاں نے اسے نیباں آتے ہی دے دی تھی۔

”درخشاں! اس چاپی کو رکھو! تمہارے کام آئے گی۔ فاخرہ شاپنگ وغیرہ کے لیے گھر سے باہر نکلی رہتی ہے۔ نہ سکتا ہے تم یونیورسٹی سے آؤ تو گھر پر تالاگا ملے۔ اس وقت یہ چاپی تمہارے کام آئے گی۔“

لیکن اس چاپی کے استعمال کی آج تک ضرورت نہ پڑی تھی۔

پھر وہ نے بہت آہنگی سے دروازے کے والے میں چاہی
سمانی۔ دروازے کو پہنچا سادھنا دیا۔ وہ بے آواز کھل گیا۔ پھر دروازہ
کھلا جھوڈ کر ہی آگے بڑھی۔ وہ دروازے کو کتنا ہی آہنگی سے بند
کرتی، کھلکھل کی آواز ضرور ہوتی اور یہ آواز انہیں چونکا بھی سکتی تھی۔ وہ
نہیں چاہتی تھی کہ انہیں ذرا بھی ہوشیار ہونے کا موقع ملے۔
درخشاں نے دبے قدموں فاخرہ کے کمرے کا رخ کیا۔
کمرے کا دروازہ تھم و اتحا اور اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
درخشاں نے ایک جھٹکے سے پورا دروازہ کھول دیا۔
دروازہ جب زور سے دیوار سے لگا تو وہ دونوں چونک اٹھے۔
درخشاں نے اسے دیکھا جس کی خاطر بھابی نے بھیا کی عزت کو
خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ ایک نیکرو تھا۔ بعض کا لے بھی پر کشش ہوتے
ہیں، لیکن اس میں کشش نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ موٹے بھدے ہونتے

عشق کا عین

یہ کہانی عشق کے موضوع پر ایک یادگار تحریر ہے۔
البھی بخش کو پہلی نظر میں عشق ہوا تو یہ کوئی حیرت کی
بات نہیں اسکا خمیر ہی عشق کی مشی سے اٹھا تھا۔
محبت پہلی نظر میں اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی سے
جتنا وہ کسی طرح ہمسر نہیں۔

ابھی پڑھئے ”اردو رسالہ“ پر

کچن میں جا کر اس نے پانی میں گلوکو زڈال کر پیا اور صوفے پر بیٹھ کر
باہر بالا لے کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

پونے بارہ بجے کے قریب گھر کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازے
میں گلی چھپی آنکھ سے باہر دیکھا۔ سامنے باہر بالا لکھڑا تھا اس نے
جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ باہر بالا اندر آیا۔

”ہاں بھی درختاں تم نے تو مجھے پریشان کر دیا، فون بھی اتنی
جلدی بند کر دیا تم نے کہ میں کچھ اندازہ ہی نہ لگا سکا۔ بہر حال اب
میں تمہارے کہنے کے مطابق گھر آگیا ہوں۔ اب مجھے معاملہ بتاؤ اور
یہ تم بلدی کی طرح زرد کیوں ہو رہی ہو؟“

”بھیا، آپ ذرا بیڈروم میں جا کر دیکھیں۔“ درختاں کی آنکھوں
میں آنسو چھمکنے لگے۔

”ارے کیا ہوا؟“ پریشان ہو کر باہر بالا نے بریف کیس میز پر

بچیلی ہوئی تاک، اٹھتے تو جیسی رنگت، لمبورگ اچھرو۔

وہ دونوں اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔
ایک لمحے کو انہیں یقین ہی نہ آیا کہ دروازے پر واقعی کوئی کھڑا ہے اور
اگر کوئی کھڑا تو وہ درختاں ہی ہے۔ وہ اندر کس طرح آگئی آخر۔
پھر فاخرہ نے نہیں، کہتے ہوئے چیخ ماری اور بے ہوش بوجئی۔

اس نیکرو نے فاخرہ کو بے ہوش ہوتے دیکھا تو وہ جبشی وہ کالا آدمی
درختاں کو دھکا دیتا ہوا فلایٹ سے بھاگ گیا۔

کوئی اور وقت ہوتا اور ناخراہ اس طرح بے ہوش ہو کر گرتی تو وہ
بھاگ کر اس کے پاس پہنچ جاتی، لیکن آج اتنا کچھ دیکھ لینے پر اس
کے قدم پتھر ہو گئے۔ فاخرہ کی اس حرکت نے اس کے اعصاب کو
چھنجوڑ کر کھدیا تھا۔ اس نے بیڈروم کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر دیا
پھر اس نے فلایٹ کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ جواب چوپٹ کھلا پڑا تھا۔

ساری بات بتاؤ۔“

جواب میں درخشاں نے وہ سب کچھ کہہ سنایا جو اس نے دیکھا، نا اور محسوس کیا تھا۔

ابھی وہ یہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ بیڈروم کا دروازہ کھلا۔ فاخرہ لرزتے قدموں سے باہر آئی اور باہر بلاں کے قدموں میں گر پڑی۔ ”مجھ سے غلطی ہو گئی“ باہر میں بھٹک گئی تھی۔ اب آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“

باہر بلاں نے نفرت سے ٹھوکر مار کر اسے پرے دھکیل دیا اور بولا۔ ”نبیں، تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، غلطی مجھ سے ہوئی ہے تم پر بھروسا کر کے۔ خدا جانے یہ کھیال کب سے جاری تھا۔ بھلا ہو میری بہن کا جس نے میری آنکھوں پر بندھی پی کھول دی اور وہ سب کچھ سوچ کچھ کرنا ہے۔“

رکھا اور تیزی سے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔

چند لمحے بعد جب وہ واپس آیا تو سب کچھ جان چکا تھا۔ اس نے وہ پینٹنگ بھی دیکھ لی تھی جو کمرے میں سائیڈ نیبل پر رکھی ہوئی تھی۔

”کون تھا وہ؟ میں اسے قتل کر دوں گا۔“ یا بر بلاں نے صوفے میں دھستے ہوئے کہا۔ غنے میں اس کا براحال تھا۔

”اسے کیوں قتل کرتے ہیں قتل کرنا ہے تو اسے قتل کیجئے جس نے آپ کی عزت کا جنازہ نکالا ہے۔“

”میں اسے بھی نہیں چھوڑ دیں گا۔“

”نبیں بھیا، ایسا کچھ نہیں کرنا ہے۔ غنے اور جوش میں آنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے جو کچھ کرنا ہے، مہنڈے دل سے کرنا ہے، سوچ کچھ کرنا ہے۔“

”یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ تمہیں کیسے پتا چلا؟ مجھے ذرا تفصیل سے دکھا دیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس گھر میں تمہیں پناہ

”اور الچا بھری آواز میں بولی۔ ” درختان، تم مجھے بچاؤ۔“

”فاخرہ، تمہیں یاد ہے، صحیح میں نے تم سے کیا کہا تھا، میرے بھیا
بہت سید خدا آدمی ہیں، اس وقت بھی انہوں نے شرافت دکھائی ہے۔

و تمہیں، تمہارے گھر تک چھوڑنے جا رہے ہیں۔ تمہارا جرم بہت
گھنا و نا ہے، کوئی اور مرد ہوتا تو تمہاری تکابوٹی کر کے باہر کتوں کو ڈال
دیتا۔ جاؤ، اپنا سامان باندھ اور یہاں سے درفع ہونے کی تیاری
کرو۔“ درختان نے انتہائی نفرت سے کہا اور دوسری طرف منہ پھر
لیا۔

”میں اس گھر سے نکل کر کہیں کی نہ رہوں گی، مر جاؤں گی۔“

”یہ سب تو عشق کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا، دیسے ایک
صورت اور ہو سکتی ہے تم اس کے نیگر کے گھر کیوں نہیں چلی

جاتیں؟“

نہیں ملے گی اپنے کپڑے اور زیورات سمیٹ اؤ میں تمہیں تمہارے
گھر تک چھوڑ آؤں گا۔ تمہارے والدین کو تمہارے خاندان والوں
کو بتا کر آؤں گا کہ تم کیسی بُو۔ میں وہاں ایک ایک رشتہ دار کو

تمہارے بارے میں بتاؤں گا تاکہ آئندہ تمہیں کوئی اپنانے کا سوچ
بھی نہ سکے۔ اول تو تمہارے شریف والدین جب یہ سینیں گے تو شاید
و بھی تمہیں گھر میں رکھنے سے انکار کر دیں۔ تم نے اس گھر کا اعتبار کھو
کر سب کا اعتبار کھو دیا ہے۔ اب تم زندگی بھرتا میں انفرت زندگی گزارو
گی اور یہ سزا قتل سے کہیں عذاب ناک ہے۔ جاؤ، اب میرے
سامنے سے اپنا تعلیظ چہرہ بھٹاوا۔“

لیکن وہ اس کے قدموں میں گری، سکتی رہی۔ تب با بر بلال خود
وہاں سے اٹھ گیا اور درختان کے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔
با بر بلال کے جانے کے بعد اس نے درختان کے گھنے کپڑے لیے

جیسی عورتوں کو کبھی عزت کی زندگی را سنبھال سکتی تھم یہوی کے روپ میں طوائف کا لمحہ کانہ کسی شریف آدمی کا گھر نہیں بازار ہوتا ہے۔

چاؤ یہاں سے۔ درختان نے اسے دھنکا دے کر دور دھکیل دیا۔

فاخرہ روتی، سکتی بپڑ روم میں چلی گئی۔

درختان کا سرگھوم رہا تھا، وہ وہیں صوفے پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد یا برابلآل اس کے کمرے سے نکلا اور اس کے قریب آ کر

بولا۔ ”درختان میں باہر جا رہا ہوں۔ نکٹ وغیرہ لے آؤں۔ میں کوشش کروں گا کہ آج رات کی فلایٹ سے نیٹھیں ملن جائیں۔“

”بھیا، آپ خود کیوں جارہے ہیں، اسے تباہ بھیج دیں اور یہاں سے ابو کو ٹیلی فون کر دیں اور خط لکھ دیں، وہاں وہ سنپھال لیں گے۔“

”نہیں درختان، میں خود اس کے ساتھ جاؤں گا۔ اس کو کیا بھیجا تو جا سکتا ہے، وہاں جا کر مظلومین بن جائے۔ وہاں کوئی اور ہی کبمانی نہ

”وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے۔“

”تمہیں ملا کہاں تھا؟“

”میوزک اکیڈمی میں، والکن بجانا میں نے اسی سے سیکھا ہے۔“

”اچھا تو وہ تمہارا انسر کر رہا تھا۔ بہت خوب، اب تم اسے ٹیلی فون کر کے ساری صورتحال بتاؤ۔ ہو سکتا ہے، وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر تمہیں اپنا لے۔“

”یہاں بیوی کو طلاق دینا اتنا آسان نہیں ہے۔“

”اور عشق کرنا آسان ہے۔“ اس نے فاخرہ کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں شرم نہ آئی یہ سب کرتے ہوئے، آخیر میرے بھائی میں کیا کمی تھی، کیا بگاڑا تھا انہوں نے تمہارا جس کی اتنی بڑی سزا دی تم نے۔ میں اگر اپنے بھائی کی جگہ ہوتی تو تمہیں اسی شہر میں بھیلنے کے لیے چھوڑ دیتی۔ پھر دیکھتی، تمہارا کون ساعاٹ تھمہیں پناہ دیتا ہے۔ تم

دے۔ خاندان کا معاملہ ہے۔ ابوکس کس کی بات کا جواب دیں گے۔ کے ذریعے ایر پورٹ چلے گئے جبکہ امجد نے اپنے گھر کا رخ کیا۔ خاندان کے بزرگوں کو میں ہی تماں کر سکوں گا۔“

امجد نے کہا بھی کہ وہ اسے ایر پورٹ چھوڑ دے گا، لیکن باہر اس کے لیے راضی نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ واپسی میں بہت دری ہو جائے گی بس تم درختاں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

باہر بلاں نے فاخرہ کو پوری آزادی دی تھی کہ اس گھر میں اس کی جو چیز ہے اٹھا لے۔ فاخرہ نے اس گھر میں اپنی جو چیزیں تھیں سب سمیٹ لی تھیں، زیورات ان چیزوں میں مر فہرست تھے۔

گھر سے رخصت ہوتے ہوئے فاخرہ نے درختاں کو کھانا نے والی نظر وں سے دیکھا تھا۔ امجد کی بیوی عقیلہ اس سے تمام تفصیلات پوچھ رہی تھی۔ وہ بتا بھی رہی تھی، لیکن بار بار فاخرہ کی گھورتی نظریں حاصل کر لیں اور اپنے پاکستانی دوست کو ٹیکلی فون بھی کر دیا۔ گیارہ بجے کے قریب امجد اپنی بیوی کے ساتھ درختاں کو ساتھ لے جانے کے لیے آگیا۔ وہ سب بیک وقت گھر سے نکلے باہر اور فاخرہ نیکسی

”اوہ مس، آپ آگئیں یہ پیکٹ آپ کوں گیا، بس میں یہی چیک کرنے آیا تھا۔“

”سنؤیہ پیکٹ یہاں کس نے رکھا؟“ درختاں نے پوچھا۔
”پروفیسر ڈینی نے۔“ جون نے بتایا۔ ”آپ کل آئی نہیں تھیں تو داخل ہوئی تو اسے اپنی میز پر ایک پیکٹ رکھا ہوا نظر آیا۔ وہ تیزی سے دیکھنے کا غذ پر میز کی طرف بڑھی۔ اس نے بے قرار میز سے پیکٹ اٹھالیا۔ سبز کاغذ پر سفید چٹ لگی ہوئی تھی اور اس پر لکھا تھا۔ ڈینی کی جانب سے اس کے نیچے ڈینی کے دستخط تھے اردو میں۔ ڈینی نے درختاں سے اردو میں اپنا نام لکھنا سیکھ لیا تھا۔ نام کے نیچے تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ یہ تاریخ کل کی تھی۔ اوہ تو یہ پیکٹ کل سے یہاں پڑا ہے۔ کیا خود پروفیسر ڈینی یہاں پیکٹ بھی مل گیا ہے؟“ ٹھیک ہے۔“

لیب بوائے کے جانے کے بعد درختاں نے سبز کاغذ کو پھاڑا۔ اندر سے ایک کتاب اور ایک کیسٹ نکلا۔ کتاب کھولنے پر معلوم ہوا کہ وہ کتاب نہیں، ڈائری ہے اور وہ بھی بالکل سادہ۔ اس نے اس ڈائری کا ایک ایک ورق اچھی طرح کھول کر دیکھی ڈالا، لیکن اس پر کوئی جون اندر داخل ہوا۔

آج کی رات بھی درختاں پر قیامت بن کر نازل ہوئی تھی۔ وہ پوری رات کروٹیں بدلتی وہی۔ یہاں تک کہ صحیح ہو گئی۔

صحیح تک وہ پوئیور سمجھی پہنچی اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کے کیبن میں داخل ہوئی تو اسے اپنی میز پر ایک پیکٹ رکھا ہوا نظر آیا۔ وہ تیزی سے دیکھنے کا غذ پر میز کی طرف بڑھی۔ اس نے بے قرار میز سے پیکٹ اٹھالیا۔ سبز کاغذ پر سفید چٹ لگی ہوئی تھی اور اس پر لکھا تھا۔ ڈینی کی جانب سے اس کے نیچے ڈینی کے دستخط تھے اردو میں۔ ڈینی نے درختاں سے اردو میں اپنا نام لکھنا سیکھ لیا تھا۔ نام کے نیچے تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ یہ تاریخ کل کی تھی۔ اوہ تو یہ پیکٹ کل سے یہاں پڑا ہے۔ کیا خود پروفیسر ڈینی یہاں رکھ کر گئے یا کسی سے بھجوادیا تھا؟ ابھی وہ اس پیکٹ کو والٹ پلٹ کر دیکھی ہی رہی تھی کہ لیب بوائے ابھی وہ اس پیکٹ کو والٹ پلٹ کر دیکھی ہی رہی تھی کہ لیب بوائے جون اندر داخل ہوا۔

ڈائری کے ان سادہ ورقوں کی قسم
میں خود بھی ان ورقوں جیسا ہونا چاہتا ہوں
دل سے اس کی محبت نکل جائے
ذہن سے یادیں مٹ جائیں
لیکن کیا یہ سب
میرے مٹتے سے پہلے ہو سکے
درخشاں تو پہلے ہی کیا کم ادا س تھی کہ اس تختے نے اسے مزید بے
کل کر دیا۔ ڈینی، تم اگر تختے مرتے دم تک نہیں بھلا سکو گے تو میں بھی
تمہیں مرتے دم تک نہیں بھلا سکوں گی۔ میں اپنی کتاب محبت کے
اوراق کوئس طرح سادہ کر سکوں گی۔ ان یادوں کو کیسے مٹا سکوں گی۔
ڈینی، میں بھی تمہاری طرح تم سے محبت کرتی ہوں۔
یہ سب سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر

تحریر نہ ملی۔ البتہ درمیان کے صفحات پر پھول ضرور لگے ہوئے تھے۔
اس نے اس ڈائری کو اپنے بیگ میں ڈالا اور آڈیوریٹی یو لائبریری میں
پہنچ کر..... کیسٹ کو کیسٹ پلینر میں لگا دیا پھر اپنے کانوں میں
ریسیور لگا کر کیسٹ سننے لگی۔

یہ کیسٹ بھی ڈائری کی طرح تقریباً خالی تھی۔ شروع میں ڈینی کی
آواز میں چند جملے بھرے ہوئے تھے اور اس۔

ایک تو احمد فراز کا شعر تھا جسے ڈینی نے بڑے اٹک اٹک کر امریکی
لبجے میں پڑھا تھا۔

اب کے ہم پچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں

اس کے بعد انگریزی کی جھوٹی سی نظم تھی جو اس نے دل چیرنے

ڈیپارٹمنٹ میں اس کا دل نہ لگا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر ابجد کے گھر چلی فلامنٹ نمبر درخشاں کو بتا دیا تھا۔
گئی۔

بابر بلال، فاخروں کو ایئر پورٹ سے سیدھا اس کے گھر لے کر پہنچا

درخشاں کو بابر بلال کی جانب سے بہت فکر تھی۔ پتا نہیں، وہاں پہنچ تھا، لیکن خود گھر میں داخل نہیں ہوا، گھر کے باہر گیٹ پر رک گیا۔

ناخرہ کے ابو اور امی دونوں فوراً گیٹ پر آئے اور بولے۔ ”تم بیان کیوں رک گئے؟ اور اندر راؤ؟“

”نہیں، میں اندر نہیں جاؤں گا، آپ ڈرائیکٹ روم کھول دیجئے، وہاں بیٹھ کر آپ سے باتیں ہوں گی۔“

ادھر اندر فاخراہ اپنی بہنوں کے گلے لگ کر روئے جا رہی تھی۔

ادھر بابر گھر میں آنے سے احتراز کر رہا تھا۔ باپ کا فوراً ما تمہاں نہ کہا تھا،

لیکن انہوں نے اس کااظہار نہ ہونے دیا اور بابر کو ڈرائیکٹ روم میں

لے آئے۔

”ڈرائیکٹ روم میں پہنچ کر بابر بلال نے ایسا دھماکہ کیا کہ اس گھر

کر کیا ہوا ہو۔ اس نے بابر سے ٹیلی فون پر صورتحال بتانے کو کہہ دیا تھا۔ پتا نہیں، وہ وہاں سے فون کرتے ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ

سوچتے ہوں کہ اب ٹیلی فون کیا کرنا، وہاں پہنچ کر زبانی ہی سب کچھ بتا دوں گا۔

جب درخشاں انتظار کر کے مایوس ہو گئی تو پانچویں دن بابر بلال کا فون آیا۔

وہ بہت خوش تھا۔ اس نے فاخراہ کو طلاق دے دی تھی۔ فاخراہ کی

جو وہاں درگت بینی تھی، اس کا مختصر حال اس نے مزے لے لے کر سنایا

تھا۔ اس نے واپسی کے لیے سیٹ کنفرم کرالی تھی اور دن تاریخ اور

خاندان کے چند بزرگوں کو اکٹھا کیا۔ سارے واقعات ان کے سامنے
دہرائے اور ان سے پوچھا۔ ”میں اب کیا کروں؟“

”ایسی حرافہ کے ساتھ کون زندگی گزار سکتا ہے، فوراً طلاق دے
مارا اور باہر سے کہا۔“

دو۔“

تب باہر بلال نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے فاخرہ کو طلاق
دے دی اور یہ سب کرنے کے بعد اس نے درختان کو شیلی فون کیا اور
اسے خوش ہو ہو کر ساری رو ردا سنائی۔ درختان بھی یہ سن کر خوش ہو گئی،
کہ چاؤ معاملہ بخیر و خوبی نہت گیا۔

باہر بلال جب کراچی سے نیو یارک پہنچا تو اس نے فاخرہ کے
بارے میں مزید بتایا اس سے معلوم ہوا کہ معاملہ نہ صرف بخیر و خوبی
نمٹ گیا بلکہ فاخرہ بھی اپنے انجام کو تینچ گئی۔

فاخرہ پر چاروں طرف سے لعنت ملامت جو رہی تھی۔ ہر شخص اس

کی عزت کے پر نچے دور دور تک اڑ گئے۔ فاخرہ کے ابوحنیف بڑے
شریف اور مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ بیٹی کے کرتوت سن کر وہ آتش
فسان بن گئے۔ اپنے بوش میں نہ رہے۔ انہوں نے فاخرہ کو بہت
مارا اور باہر سے کہا۔ ”بیٹا، تم اسے یہاں کیوں لے آئے؟ اسے کا اوس
کی بستی میں چھوڑا آتے؟ اب یہ اس قابل نہیں کہ میں اسے اپنے گھر
میں رکھوں۔“

حنیف غصے اور صد میں سے ٹھھال ہو کر بیتال پہنچ گئے ان پر
دل کا دورہ پڑا تھا۔

پھر یہ بات پورے خاندان میں سینہ بہ سینہ جنگل کی آگ کی طرح
بڑی تیزی سے پھیل گئی۔

فاخرہ اپنے کرتوت کی وجہ سے کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہ رہی
تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کرے میں قید کر لیا۔ پھر باہر نے

گیا، لیکن وہاں وہ چار پانچ گھنٹے جان کرنی کے عالم میں رہ کر مر گئی۔

”مرتے وقت اس نے کسی سے کچھ کہا“ درختان نے سارے
واقعات سن کر بابر بلاں سے پوچھا۔

”مرتے وقت اس کے پاس کوئی نہ تھا، وہ کہتی کس سے۔“ بابر
بلاں نے بتایا۔

”کرنے سے پہلے؟“

”کرنے سے پہلے بھی وہ کچھ نہیں بولی، وہ اس قابل روکھاں گئی
تھی۔ وہ کسی سے کیا کہتی؟ اس کی کون سنتا۔“ بابر بلاں نے کہا۔
بابر بلاں کی نیویارک واپسی کے بعد وہ لوگ اپنے گھر میں شفت
پناہ۔

ہو گئے۔

اتی رات درختان نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ شعلوں میں
گھری ہوئی تھی، اور بہت غنے میں تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”درختان،

پلنٹوں کے سنگ برسا رہا تھا۔ خاندان کی بڑی بوڑھیوں کے ہاتھ
ایک اچھا مشغلا آگیا تھا۔ اس پر ہر طرف سے نشتر زلتی ہو رہی تھی۔

خاندان کے لوگ یا پاس پڑوس والے جو کہتے کم تھا، لیکن گھر میں
فارخہ کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ بہنوں نے منہ موڑ لیے

تھے۔ بھائیوں نے شکل دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ماں نے پوچھنا
چھپوڑ دیا تھا اور ایو ہسپتال میں تھے۔ انہیوں نے کہا بھیجا تھا کہ فارخہ
بیہاں نہ آئے۔ فارخہ کے سراب کوئی چھپت نہ رہی تھی اور یہ سب
اپنے شوہر سے بے وفاً کا نتیجہ تھا۔ کوئی جائے مفتر تھی، نہ کوئی جائے
پناہ۔

تب فارخہ نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے سوا
کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس نے یا تھر دوم میں رکھی کیڑے مار دوال کی
پوری شیشی اپنے حلق میں انڈیلی لی۔ فوری طور پر اسے ہسپتال پہنچایا

میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔ تو نے مجھے بہت ذلیل کروایا ہے۔ میں تجھے اور بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتے گی۔

جیسے ہی اسے نیندا آنے لگتی، اس پر غنوادگی چھاتی تو اسے فوراً وہ خواب یاد آ جاتا۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔ اسی طرح سوتے جائے گتے صبح ہو گئی۔

اس وقت وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ جب گھری کا الارم بجا۔ گھری کی چیخ، کسی عورت کی چیخ بن گئی۔ وہ ہر بڑا کرائھا بیٹھی۔ گھری میں ساڑھے چھبے تھے۔ وہ الارم لگا کر اس لیے سوئی تھی کہ باہر بلال کو نہیں وقت پر ناشستہ دے سکے۔

”بھیا، آج رات میں نے خواب میں فاتحہ کو دیکھا تھا۔“

درختان نے ناشستے کی میز پر با بر کو بتایا۔

”اچھا، کس طرح دکھائی دی تھی؟“ با بر نے پوچھا۔

”بھیا، وہ شعلوں میں لمبی ہوئی تھی اور اس نے مجھ سے بڑے

سے انتقام لے کر رہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ درختان کی طرف چھپتی۔ درختان چھپتی ہوئی بھاگی۔

تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل بامیوں اچھل رہا تھا۔ خوف کے مارے وہ پسینے میں نہایتی ہوئی تھی۔ یہ خواب اس قدر رواضح، مگر اور صاف تھا کہ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے فاتحہ بیان خود موجود تھی۔ کچھ حواس بحال ہوئے تو اس نے کمرے کی بیتی جائی گھری پر نظر ڈالی۔ رات کے دو بجے تھے۔

کچن میں جا کر اس نے ایک گلاں پانی پیا اور اُنہیں وہی لاڈنگ میں پڑے ایک صوف پر بیٹھ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ بھیا کو اٹھادے، لیکن بھیا کیا کہیں گے۔ ایک خواب سے ڈر کر خوان خواہ ان کی نیند خراب کر دی۔ پھر وہ انہیں اٹھانے کا ارادہ ملتا ہی کر کے اپنے کمرے میں آگئی

غئے میں کہا تھا، میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔ میں تجھے سے انتقام لے کر
اتنی دیر میں کچھ نہیں ہی مرتب کر لے، لیکن اس کا کام میں دل نہ لگا۔
رو رہ کر اسے فاخرہ میاد آ جاتی۔ شعلوں میں گھری بھوئی غئے میں تجھنی
رہوں گی۔” یہ بتاتے ہوئے درخشاں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ”بھیا
رات کو تجھے بہت ڈر لگا،“ کہنی بار آپ کو جگانے کا ارادہ کیا۔“

پھر اس نے وقت مقررہ پر یونیورسٹی کا رخ کیا۔ درخشاں کے
اعصاب پر بہت دباؤ تھا۔ دن پندرہ دن سے وہ مسلسل ذہنی دباؤ میں
چلی آ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ کی سے اپنے دل کی بات کرنے
لیکن کوئی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنے بارے میں بات کر سکتی۔ ایک
پروفیسر ڈینی تھا جس سے بات کر کے وہ خوشی محسوس کرتی تھی۔ اب وہ
بھی اس سے دور ہو گیا تھا ایسا اس نے خود ہی کیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں
ہوتی تو پروفیسر ڈینی اسے یاد آتا رہتا اور جب گھر آ جاتی تو فاخرہ اس کا
ہوتی تو پروفیسر ڈینی اسے یاد آتا رہتا اور جب گھر آ جاتی تو فاخرہ اس کا
پیچھا شہ چھوڑتی۔ زندگی عجیب، الجھنوں کا شکار ہو گئی تھی۔

اس رات وہ ایک خوفناک قلم دیکھتے ہوئے بری طرح چھپتی تھی۔

”ہاں تو انجائیتی، ذیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہ محض خواب کی
باتیں ہیں۔“ با بر نے تسلی دی۔
”لیکن بھیا، تجھے ایسا لگا جیسے یہ خواب نہ ہو وہ جسم ہو کر میرے
سانے آگئی ہو۔“ درخشاں بولی۔
”اچھا اچھا، اب زیادہ سمجھیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنے
ذہن کو جھٹک کر صاف کرو۔“ با بر بلاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اسے
دفتر کے لیے دیر ہو رہی تھی۔

با بر کے جانے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا اور اپنا
کام لے کر بینہ گئی۔ ابھی یونیورسٹی جانے میں وقت تھا۔ اس نے سوچا،

اس کی چنیں سن کر بابر بلاں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دوڑتا ہوا درختان میں چاروں طرف دیکھا۔
کے کمرے میں آیا۔ درختان بیٹھ پڑنے کی بھروسہ بھی نہیں تھی۔
”آپ نے اسے لاوَنْج میں پہنچا دیا؟“ درختان نے پوچھا۔
اس نے باز کو آنے ہوئے بھسی نہ دیکھا۔

”مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ میں تو بڑے آرام سے پڑھائی میں گئی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے فلم کا خیال آیا۔ ارے، آج تو قلم کا دن ہے۔
پھر ایسی بلا ارادہ میں نے اخبار اٹھا لیا۔ فلم اچھی معلوم ہو رہی تھی۔
میں نے سوچا چلو تھوڑی دیر دیکھ لیتی ہوں۔ جب ڈر لگنے لگے گا تو بند کر دوں گی۔ یہ سوچ کر میں اُنہیں دی ٹرالی لاوَنْج سے کھینچ کر اپنے
کمرے میں لاتی اور اُنہیں آن کر کے بستر میں کمبل اوڑھ کر بینٹھ گئی۔
فلام شروع ہو چکی تھی۔ نائلہ چل رہے تھے۔ پھر جب فلم میں خوفناک مناظر شروع ہوئے تو میں نے نیلی ویژن بند کرنے کا ارادہ کیا، لیکن میں اس ارادے کو ملی شکل نہ دے سکی۔ سوچتی رہی کہ یہ منظر ختم ہو

”درختان بھوش میں آؤ۔“ اس نے درختان کو جھینکوڑ دیا۔ ”کیا ہوا، کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھیں؟“
”دنہیں تو۔“ اس نے اپنے گرد کمبل پیشیتے ہوئے کہا۔
”پھر کیوں چیخ رہی تھیں؟“ بابر نے پوچھا۔
”میں فلم دیکھ کر ڈر گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔
”خدا کے واسطے درختان، اپنے آپ پر حکم کرو۔ یہ خوفناک فلم میں دیکھنا چھوڑ دو۔“
”بھیا، کیا اُنہیں دی اپنے بند کیا؟“
”ٹی وی، یہاں کہاں ہے ٹی وی؟“ بابر نے حیرت سے کمرے

”تم نے شاید خواب میں ڈراونی فلم دیکھی ہے۔“ بابر بلاں نے
خیال ظاہر کیا۔

”نہیں، میں نے حقیقت میں فلم دیکھی ہے، یہ دیکھیے، یہ میرے
کاغذات پھیلے ہوئے ہیں، میں پڑھتے پڑھتے اٹھی تھی۔ وہ سامنے بیٹھ
پر اخبار پڑا ہے، اس میں میں نے فلم کا پروگرام دیکھا تھا، دیکھئے، اب بھی
وہی صفحہ کھلا ہوا ہے۔“ پھر اس نے گھری دیکھی اور بولی ”اس وقت سوا

بجا ہے، میں نے تقریباً ایک گھنٹا وہ فلم دیکھی ہے۔ وہ فلم اب بھی ٹھیک
ویژن پر چل رہی ہوگی، آپ ٹوی وی کھوں کر دیکھیں۔“

بابر بلاں کچھ سوچ کر کمرے سے باہر آیا۔ اگر ٹھیک ویژن ایک
گھنٹے چلا ہے تو وہ گرم ہو رہا ہوگا اور اس کا چینل بھی بدلا رہا ہوگا۔

درختان بھی اس کے ساتھ باہر آئی۔

ٹوی ٹرالی، اپنی جگہ پڑھی۔ دیکھنے سے نہیں معلوم ہوا تھا کہ

جائے تو پھر بند کرتی ہوں۔ منظر پر منظر بدلتے رہے اور میں ارادے
کے باوجود ٹوی بند نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ ایک منظر دیکھ کر میری
چینیں نکل گئیں۔ اس کے بعد آپ آگئے۔ آپ نے مجھے چھٹا دیکھ کر
ٹھیک ویژن بند کر کے اسے کمرے سے باہر تکمیل دیا۔ میرے ہوش
بحال ہوئے تو میں نے کمرے میں آپ کو دیکھا، ٹھیک ویژن کہیں نظر
نہ آیا۔“

”لیکن درختاں جب میں کمرے میں آیا تو یہاں کوئی ٹھیک ویژن
نہیں تھا، بس تم بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں، ہی تھیں، البتہ تمہاری نظر میں کسی
نا دیدہ چیز پر ضرور جسمی ہوئی تھیں۔ ٹھیک ویژن تو لا اونچ میں اپنی جگہ رکھا
ہے۔“ بابر بلاں نے اسے بتایا۔

”آپ کج کہہ رہے ہیں بھیا؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
درختاں کو یقین نہ آیا۔

”اچھا، اس موضوع پر اب صحیح بات کریں گے، اب تم سو جاؤ۔
میرے کمرے کا دروازہ مکھلا ہے۔ تمہیں خوف محسوس ہوتا مجھے اٹھا
لینا۔“ یہ کہہ کر اپنے نے کمرے کا رخ کیا۔
باہر بیڈ پر لیٹا تو اسے نیندنا آئی۔ وہ عجیب مخہصے میں پھنس گیا تھا۔
درخشاں کا بیان تھا کہ وہ تی وی دیکھتے ہوئے چیختی تھی حالانکہ جب وہ
اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا، وہاں تیلی ویژن نہ تھا۔ وہ تنہا پیشی
چیز رہی تھی۔ درخشاں کا خیال ہے کہ اس نے تیلی ویژن بند کر کے
وہاں سے ہٹایا، میکن اس نے کمرے میں تی وی پایا ہی نہیں تو ہٹاتا
کیسے۔ اگر یہ بھی درخشاں کا وہ مقدمہ تھا۔ اس نے کوئی دراؤنا خواب
دیکھا تھا تو تی وی اتنا گرم کیسے تھا، جیسے ابھی پارنج منٹ پہلے بند کیا گیا
ہو، پھر چینیل کس طرح تیدیل ہوا تھا۔

پھر یہی سوچتے سوچتے اسے نیندا آگئی۔ جیکہ خوف کے مارے

اے ہلا یا گیا ہے۔

باہر بلال نے ٹرالی ذرا سی آگئے کر کے اس کی بیک چھوکر دیکھی۔
وہ گرم ہو رہی تھی۔ پھر اس نے تی وی آن کر دیا۔ چینیل وہی روشن ہوا
جس پر خوفناک فلمیں آتی تھیں جبکہ باہر نے تی وی بند کر دیا تھا۔
درخشاں اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔

وہ خوفناک فلم اب بھی ٹیلی ویژن پر آ رہی تھی۔
باہر نے اس فلم کو چند لمحے دیکھ کر تی وی بند کر دیا۔
”اب بتائیے بھیا، یہ خواب تھا یا حقیقت؟“ درخشاں نے کہا۔

”یاد رکھ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ دیں گی۔“ اس نے کہا اور اس کی طرف چھپی۔

درخشاں چیخ مار کر دروازے سے پاہر بھاگی۔ اس نے باہر نکل کر فوراً دروازہ بند کر دیا اور کھڑے ہو کر ہانپہنچ گئی۔ خوف کے مارے اس کا جسم تھرٹھر کا نیپ رہا تھا۔ نیند کو سوں دور بھاگ گئی تھی۔

پہلے تو اس نے فاخرہ کو خواب میں دیکھا تھا، لیکن کیا اس وقت بھی یہ خواب تھا؟ اس پر نیند غالب ضرور تھی، لیکن اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا کیونکہ وہ فاخرہ کے بارے میں سوچتی ہوئی آرہی تھی لہذا اس کے خیال تے یہ صورت اختیار کر لی۔ یہ مخفی اس کا جب وہ دروازہ کھول کر فلایٹ میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ واہمہ تھا۔

پھر اس نے بہت کر کے دروازہ کھولا اور چند لمحے دروازہ کھول کر کھڑی رہی۔ اس کو کچھ فظر نہ آیا۔ پھر وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر ہی آگے

دھشاں پوری رات جاگتی رہی۔ صبح کو دیر سے اس کی آنکھ کھلی اس وقت آٹھ نئے رہے تھے۔ وہ ہزر بڑا کراٹھی۔ گھڑی کا الارم شاید بجا نہیں تھا یا وہ لگانا ہی بھول گئی۔ باہر بلاں دفتر جا چکا تھا۔ اس نے خود ہی ناشتا بنا لیا تھا۔

درخشاں نے بھی جلدی جلدی گھر سے نکلنے کی تیاری کی۔ سہ پہر کو جب وہ یونیورسٹی سے واپس الوٹی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ اسے بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔ وہ سیر ہنیاں چڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ بس دروازہ کھولتے ہی سیدھی بستر پر جا گرے گی۔ لباس تبدیل کرنے کی بھی اس میں بہت نہ تھی۔

جب وہ دروازہ کھول کر فلایٹ میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ سامنے فاخرہ کھڑی ہے۔ وہی شعلوں میں لپٹی، غصے میں بھری۔

بڑھی۔ وہ ٹوی لاونچ تک پہنچ گئی۔ کچھ دکھائی نہ دیا اس نے پورے گھر میں ایک چکر لگایا۔ تب وہ ہنس پڑی، اپنی حماقت پر خواہ منتو اور کر باہر چالی گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس وقت باہر کوئی نہ تھا، ورنہ کیا کہتا۔ وہ تو کر کے تالا لگایا اور تیزی سے پیڑھیاں اترنے لگی۔

ابھی وہ تین پیڑھیاں اتری تھی کہ اسے نیچے سے مزنجسن آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑا سا بیگ تھا۔ شاید وہ تردیداری کر کے آرہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر درختاں رک گئی۔

مزنجسن اس کی پڑوں تھیں۔ سامنے والا فلیٹ انہی کا تھا۔

درختاں کی ان سے جان پیچان تھی۔ آتے جاتے علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ ایک دو مرتبہ فاخرہ کے سامنے وہ گھر بھی آچکی تھیں۔ وہ ایک اچھی ملنسار اور اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون تھیں۔ قدرے موٹی تھیں، اس لیے شانشگی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ درختاں نے ان کا دورہ سے استقبال کیا۔

اس نے بڑی تیزی سے دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی طرف چھپتی۔ وہ دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور تیزی سے پیڑھیاں اترنے لگی۔ خیر بعد میں کچھ کہتا، وہ اسے کیا بتاتی کہ کس چیز سے ڈر کروہ دروازے پر آئی ہے۔

پھر وہ اپس دروازے کی طرف آئی۔ کھلے ہوئے دروازے کو بند کر کے اسے لاک کیا۔

اور جب وہ اپس پیٹھی تو اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

فاخرہ شعلوں میں لپٹی، غصے میں بھری اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ”تو کب تک مجھ سے بھاگے گی، یاد رکھ میں تجھے تھیں چھوڑوں گی۔“

”اچھا، یہ تو میری خوش قسمتی ہے، خوبصورت لڑکی، آدمیرے ساتھ میں تمہیں کافی پاؤں۔“

”اوہ بہت شکریہ آپ کا۔ مجھے پڑی خوشی ہوگی آپ کے ساتھ کافی پا کر۔“

”مسز بابر کا کیا حال ہے؟ کافی دن سے وہ نظر نہیں آئیں۔“
مسز نکسن نے تالاکھوں کر گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”وہ پاکستان گئی ہوئی ہیں۔“ درخشاں نے صاف جھوٹ بولा۔
”اچھا۔ اور تمہاری ریسرچ کیسی چیل رہی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بہت اچھی۔“ درخشاں نے بتایا۔

وہ کافی دریہ وہاں بیٹھی ادھرا دھر کی یا تمیں کرتی رہی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چار منٹ بیٹھ کر وہاں سے اٹھ جاتی، لیکن اس وقت اس میں

”آئیے آئیے مسز نکسن، کہنے کیاں سے آ رہی ہیں؟“
”شاپنگ، شاپنگ۔“ انہوں نے سامان سے بھرے ہوئے تھیں کی طرف اشارہ کیا۔ اسے اٹھانے کی وجہ سے ان کا سانس بھول رہا تھا۔

”لا جائے میں آپ کی مدد کر دوں۔“ درخشاں نے جلدی سے نیچے اتر کر ان کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔ وہ خاصا بھاری تھا۔ مسز نکسن نے اسے ممنونیت سے دیکھا۔ اس کا شکریہ ادا کیا، پھر بولیں۔

”یہ خوبصورت لڑکی کیا کیاں جا رہی تھی؟“

”میں آپ کے گھر گئی تھی۔ اصل میں میں اکنہ گھر میں بورہ ہو رہی تھی تو میں نے سوچا، آج آپ سے چل کر گپ شپ لگائی جائے۔ پھر آپ کا گھر رینڈ لیکھ کر میں ابھی سوچ رہی تھی کہ کیا کروں کہ اتنے میں نظر آگئیں۔“

لیکن اسے کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر اس نے پورے گھر کا چکر لگایا کہیں کچھ محسوس نہ ہوا۔ تب اس نے اسے اپنا وابہمہ سمجھ کر اپنے دل کو مطمئن کیا۔

مرنگسن کو وہ بڑی دیر تک شادی کی رسم و رواج بتاتی رہی۔ مرنگسن بڑی دلچسپی سے اس کی یا تمیں سختی رہیں اور سوالات کر کے بہت سی یا تمیں پوچھتی رہی۔ مرنگسن بڑی دلچسپی سے اس کی یا تمیں سختی رہیں اور سوالات کر کے بہت سی یا تمیں پوچھتی رہیں۔ مرنگسن بڑی دلچسپی سے اس کی یا تمیں سختی رہیں اور سوالات کر کے بہت سی یا تمیں پوچھتی رہیں۔ درخشاں نے ان کی دلچسپی کی بات چھینگر دی تھی۔ اس نے تالا کھولا۔ مرنگسن بھی اس کے ساتھ ہی اندر آگئیں۔ وہ چاہ بھی یہی رہی تھی۔ بات ختم کر کے وہ واپس جانے لگیں تو درخشاں نے انہیں ایک کپ کافی کی پیشکش کر دی جسے مرنگسن نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا اور صوفیہ پر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔

درخشاں نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف نظر میں دوڑائیں اور..... کھانے کی میز پر کھانے کا انتظار کرتے لگا۔

اپنے گھر جانے کی بہت نہ تھی۔ اور سر دی میں باہر نکلتے کی سکت نہ تھی۔ مرنگسن ایک دلچسپ خاتون تھیں۔ ان سے باتیں کر کے اس کا دل بہل گیا۔ خوف کم ہو گیا۔ یہاں بیٹھنے ہوئے اسے کافی دیر ہو گئی تھی۔

یہاں تک کہ مرنگسن بھی پہلو بد لے گئی۔ اس نے سوچا، اب اٹھ کر جانا چاہئے۔ پھر اس نے کافی اور مزے دار گفتگو کا شکریہ ادا کیا۔

مرنگسن باتیں کرتی ہوئی، اس کے گھر کے دروازے تک آگئیں۔ درخشاں نے ان کی دلچسپی کی بات چھینگر دی تھی۔ اس نے تالا کھولا۔ مرنگسن بھی اس کے ساتھ ہی اندر آگئیں۔ وہ چاہ بھی یہی رہی تھی۔ بات ختم کر کے وہ واپس جانے لگیں تو درخشاں نے انہیں ایک کپ کافی کی پیشکش کر دی جسے مرنگسن نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا اور صوفیہ پر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔

درخشاں نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف نظر میں دوڑائیں

نگیاتی مریضہ سمجھ رہے ہیں۔“

درخشاں نے کھانا، کھانا چھوڑ دیا اور رو نے بینچ گئی۔

بابر بلال نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور کھانا کھلا یا۔

درخشاں نے خاموشی سے کھانا کھا کر برتن سمیٹے اور اپنے کمرے میں چل گئی۔ پھر اپنی پڑھائی میں لگ گئی۔

ٹھوڑی دری کے بعد بابر بلال دو گاؤں میں کافی لیے درخشاں کے کمرے میں آیا اور بولا۔ ”اوہ سختی درخشاں کافی پو۔“

”ارے بھیا، آپ نے کیوں بنائی کافی۔“ اس نگ تھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھ سے کہہ دیتے۔“

”زر اپی کر دیکھو، میں کتنی شاندار کافی بناتا ہوں۔“ بابر نے شکننگی سے کہا۔

”واہ بہت حزے کی ہے۔“ درخشاں نے خوش ہو کر کہا۔

کھانے کے دوران درخشاں نے آج شام کی ساری رو داداں کے گوش گزار کی۔ ساری باتیں سن کر بابر بلال، درخشاں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

”بھیا، شاید آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔“ درخشاں نے کہا۔

تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں، ناقابل یقین۔“ بابر بولا۔

”بھیا، میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔“ درخشاں نے اداں ہو کر کہا۔

”نہیں، میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھ رہا، لیکن تمہاری باتوں پر یقین بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا خیال ہے، اس سلسلے میں کسی ڈاکٹر سے بات کر لیں؟“ بابر بلال نے پوچھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو میری ذہنی حالت پر شبہ ہے، مجھے

”آج تھی وی پر کوئی فلم تو نہیں؟“ بابر نے پوچھا۔

”نہیں، کل آئے گی، ایک دن چھوڑ کر آتی ہے۔ اگر آپ کا اشارہ خوفناک قلم کی طرف ہے تو۔ ویسے تروزانہ ہی فلم میں آتی ہیں۔“

”میرا اشارہ تم تھیک سمجھیں، اب تم میرا ایک اشارہ اور سمجھو لو۔“

”میں ہور قلم میں دیکھنا چھوڑ دوں یہی نا؟“ درختان نے بنتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اب توبہ کرنی ہے بھیا۔ اب کبھی نہیں دیکھوں گی۔ کل بھی میں نے کافی دنوں کے بعد دیکھی تھی۔ جانے کیوں میں بے اختیار ہو گئی تھی اور پڑھتے پڑھتے شیلی و نیژن بھول کر بیٹھ گئی تھی۔“

کل کی بات انہی تک معما بی ہوتی ہے، تم کچھ کہتی ہو، میں نے کچھ اور دیکھا ہے۔ واقعات کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی صحیح ہو۔ میں بھی صحیح ہوں اور واقعات بھی صحیح ہیں۔“ بابر

بال نے کہا۔

”مجھے تو اتنا یقین ہے کہ میں نے وہ فلم خواب میں نہیں دیکھی تھی، پورے بوش و حواس میں شیلی و نیژن پر دیکھی تھی اور آج شام کو بھی میں نے فاخرہ کو خواب میں نہیں بلکہ جا گتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب میرے ذہن کی اختراع ہے اور یہ کہ مجھے کوئی نفیا تی مرض لاحق ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے، میں ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لیے تیار ہوں۔“ درختان نے کہا۔

”اصل میں درختان، ان خوفناک قلموں نے تمہارے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ آسمی فلم میں دیکھ دیکھ کر تمہیں بھیوت پریت اور آسیب پر یقین بھوگیا ہے۔“

”یہ فلم میں تو میں بہت عرصے سے دیکھ رہی ہوں، پھر یہ یقین آج کیوں ہوا۔ اگر آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ فاخرہ کا آسیب میرے ذہن کی پیداوار ہے تو اب تک تو میں جانے کتنے بھیوت بنا چکی

سامنے بھی قسم کھا لیتی ہوں۔ میں آئندہ کبھی اسی فلمیں نہیں دیکھوں ہوتی۔“

گی۔“ درخشاں نے اسے یقین دلایا۔

”اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ شب بخیر۔ ہاں تمہیں اگر ڈرموس ہو تو فوراً مجھے آ کر جاؤ لیں، او کے۔“

با بر بلال کے جانے کے بعد وہ پورے اطمینان سے پڑھتی رہی۔
کوئی گیارہ بجے کے قریب اس کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی اور یہ نیندا تیزی سے آئی کہ وہ نہ کمرے کی لائٹ بھاگ کی اور شہی اپنے کاغذات سمیٹ سکی۔ بس وہ پڑھتے پڑھتے سو گئی۔
وہ تیخ رہی تھی جسے سن کر با بر کی آنکھ کھلی تھی۔

وہ گبری نیند میں تھا، اس لیے پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کسی آواز ہے۔ جب ذرا تو اس بحال ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ یہ درخشاں کے چیخنے کی آواز ہے۔ وہ بری طرح تیخ رہی تھی اور

”تم سائنس کی طالبہ ہو، ایک حقیقت پسند اڑکی ہو، تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ اس طرح کی پاتیں محض قصہ کہانیوں اور فلموں تک محدود ہیں، حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔“

”جی، جانتی ہوں،“ میں نے آپ سے یہ کہ کہا کہ میں نے فاخرہ کا بھوت دیکھا ہے۔ میں نے تو جو واقعات پیش آئے ہیں، وہ بلاشبہ آپ کو ستادیے ہیں۔ میری خود کبھی میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“

”کچھ نہیں ہو رہا،“ تم آرام سے پڑھوا اور اب مجھ سے ایک پکا وعدہ کرو کہ تم کسی قیمت پر یہ آسی فلمیں نہیں دیکھو گی۔“ با بر بلال نے ایک مرتبہ اور یقین دہائی جاہی۔

”میں نے آپ سے کہانا کہ میں تو بہ کر لی ہے۔ اب آپ کے

”نہیں، وہ خواب نہیں ہو سکتا۔ سوتے سوتے میری اچانک آنکھ

بھیا، بھیا پکار رہی تھی۔

بابر بلال نے کمبل اٹھا کر دور پھینکا اور درختان کے کرے کی
کھاتھی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو بارہ نجھ رہے تھے۔ میں پڑھتے
پڑھتے بے خبر سو گئی تھی۔ میرے کاغذات پوں ہی بکھرے پڑے تھے

طرف بھاگا۔

اس کے کرے کی لائٹ روشن تھی اور وہ اپنا بازو پکڑے آنکھیں
کاغذات سمیٹ کر نیبل پر رکھ دوں اور پانی پی کر لائٹ بجھا کر
سو جاؤں۔ ابھی میں کاغذات سمیٹ ہی رہی تھی بھیا کہ وہ اچانک
کرے میں داخل ہوئی۔ ”درختان لرز رہی تھی۔

لائٹ بھی جل رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب آنکھ کھل گئی ہے تو
بند کیے چھینے جا رہی تھی۔

”کون کرے میں داخل ہوئی؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ بابر
نے کہا۔

”بھیا، وہ مجھے مارڈا لے گی۔“

”بھیا، وہ فاخرہ تھی۔ شعلوں میں لیٹی اور غصے سے بھری۔ اس
مرتبہ اس کے ایک ہاتھ میں چینی کا ایک بڑا سفید بیالہ تھا اور
دوسرے ہاتھ میں ایک تیز دھار کا چمکدار چاقو۔ بھیا، پھر اس نے مجھے

”کون مارڈا لے گی درختان؟“ تم نے پھر کوئی ڈراوٹا خواب
دیکھا؟“

بابرنے پوچھتا۔

”لائیں بھیا میں بنادیتی ہوں۔“

”نہیں تم میں ہو۔“ بابر نے اسے زبردستی پڑھا دیا۔ ”کافی میں بناؤں گا۔“

پھر اس نے کچن سے ایک گلاس پانی لا کر دیا۔ ”اویہ پی او۔“

سید ہٹھ میں گلاس پکڑتے ہوئے اس کے بازو میں نیس آئی ہوئی۔ وہ گلاس ہاتھ میں لے کر اپنا باز و سہلانے لگی۔ پھر اس نے گلاس بائیں ہاتھ میں لے کر جلدی جلدی پانی پیا جیسے جنم جنم کی پیاسی ہو۔

”او؟“ بابر بلال نے پوچھتا۔

”نہیں بھیا۔“ درخشاں نے جواب دیا۔

”بازو کیوں پکڑ رہی ہو؟“ بابر بلال نے پوچھتا۔
”بازو میں تکالیف ہو رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

دبوچ لیا۔ میرے بازو پر چاقو سے خراشیں ڈالیں اور جب ان لکیروں سے خون بنبے لگاتو وہ خون اس نے پیا لے میں جمع کر لیا اور پھر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ یاد رکھ میں اسی طرح قطرہ قطرہ کر کے تیر اسارا خون نکال لوں گی۔

میں تجھے تڑ پاڑ پا کر ماروں گی۔ یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ بھیا وہ ابھی گھر میں ہی ہو گی۔

”اچھا اٹھو۔“ بابر بلال نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ ”تم ابھی پورا گھردیکھ لیتے ہیں۔ تم سے بچ کر کیاں جائے گی۔“

پھر بابر بلال نے درخشاں کو گھر کا کونا کونا دکھایا؛ لیکن گھر میں کوئی ہوتا تو ملتا۔

”تم ذرا بیٹھو میں تمہارے لیے کافی بناتا ہوں۔“ بابر نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”درختاں ڈردمت“ میں ہوں تمہارے پاس۔“

”اوہ، اس نے مجھے خمی کر دیا ہے، وہ میرا سارا جو چور لے گی۔“

ارے نہیں درختاں، ایسا نہیں بوسکتا۔ آؤ انھوں میرے کمرے میں

جیلو تم وہاں سونا، میں دیکھتا ہوں، اب کون تمہارے پاس آتا ہے۔“

بابرا سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسے سہارا دے کر بیڑ

پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پر گروں میں جان نہیں رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں

وہ برسوں کی مریض دکھائی دینے لگی تھی۔

”ذراد کھاؤ“ مجھے۔“

درختاں نے اپنا بازو داں کے آجے کر دیا۔

جب بابر بلاں نے اس کی قمیض کی آستین اور پرچڑھائی تو ایک

لمحے کو دہ سکتے میں رو گیا۔ اس کے بازو پر تازہ زخم بننے ہوئے تھے

یہی کسی نے بلید سے اس کے بازو پر لکیریں بنائی ہوں۔

”دیکھیں بھیا، اب آپ خود دیکھیں۔ وہ مجھے مارڈا لے گی اللہ

یں کیا کروں۔“

پھر بابر نے اس کا بیاڑ دکھول کر ان باریک لکیروں پر جن پر خون

جم سا گیا تھا۔ ایک ٹیوب سے مرہ تم لگا دیا۔ اس کے بیاڑ پر یہ لکیریں

اس کے بیان کی تائید کر رہی تھیں۔

”لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ بابر نے سوچا۔

بابر نے اپنا بستر بیڑ کے نیچے قالین پر لگا لیا تھا۔ لائٹ جلی چھوڑ

پھر سا آیا اور وہ صوف نے پر اونڈھے منہ گری اور بے ہوش

و گئی۔ بابر بلاں نے اسے سیدھا لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف کی

لمرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ بابر نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کو زور

و رہے رگڑا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے ہاتھوں میں گرمی پیدا ہوئی پھر

س نے آنکھیں کھول دیں اور وہ شست زدہ ہو کر اٹھنے بیٹھنی۔

دی تھی اور درختان سے کہا تھا۔ ”تم اطمینان سے سو جاؤ“ میں جاگ رہا درختان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر غور کیا، لیکن دونوں کسی ہوں۔“

نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ تاہم اس بات پر دونوں متفق تھے کہ درختان کا تبا درختان آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹ بننے گھر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ باہر بیال تو صبح کا گیارات کو گھر لگتے تھے، لیکن کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

اویتا تھا۔ جبکہ درختان سے پھر تک گھر پہنچ جاتی تھی۔ پھر رات کو یہی وہ اپنے کمرے میں تباہوتی تھی۔ ڈرتی تو وہ ہمیشہ سے تھی، لیکن ان پر خدا خدا کر کے صبح ہوتے ہوئے درختان کی حالت خاصی خراب ہو گئی۔ اسرار و واقعات نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ یہاں تک کہ زروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔

اعصاب شکستگی کے یہ دورے اگر بار بار اس پر پڑتے تو وہ کسی بھی وقت موت سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ چوبیں گھنٹے اس کے ساتھ کوئی رہے اور نیو یارک میں یہ سب ممکن نہ تھا۔ لہذا المجد فے اسے مشورہ دیا کہ کراچی اپنے والدین سے بات کرو، انہیں ساری صورت حال بتاؤ اور ان سے مشورہ مطلب کرو۔

بابر نے اسے کسی طرح ہسپتال پہنچایا۔ ڈاکٹر نے وہاں معاشرے کے بعد بتایا کہ یہ زروس بریک ڈاؤن ہے۔ فوری طور پر اسے ڈرپ لگائی گئی۔ طاقتو رنجکشن دیئے گئے اور ملالات پر پابندی لگادی گئی۔ بابر کے علاوہ اس سے فوری طور پر مانے والا تھا، ہی کون۔ وہ اسے ہسپتال چھوڑ کر امجد کے پاس چلا گیا۔ وہاں اس نے

شام تک درختان کی حالت قدرت بہتر ہو گئی، لیکن کمزوری اسے سے کہا۔

بہت تھی۔ وہ خود سے انہنے بیٹھنے کے قابل بھی نہ تھی۔ شام کو با بر کو اس سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ مریضہ سے کوئی ناخوش گوار بات نہ کریں۔

”اچھا چھا“ دیکھیں گے، تمہیں افسر دہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا ابو سے بات کروں، پھر جیسا وہ کہیں گے، کر لیں گے۔“

پھر جب با بر بلال نے کراچی بات کی تواہاں سب سے پہلے امی سے بات ہوئی۔ پھر وہ امی سے جیسے جیسے بات کرتا گیا، انہوں نے سب کو آوازیں دے کر انہما کر لینا۔ سب پریشان ہو گئے۔ ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔

ابو خود پریشان ہو گئے۔ امی اور گل افشاں رو بن لگیں۔

اس طرح کی صورتحال کے پیش نظر درختان کا امریکا میں رہنا کسی طور بھی مناسب نہ سمجھا گیا۔ ابو نے با بر بلال کو ہدایت کی۔ ”بیٹا“ تم درختان کو واپس بھیج دو۔ وہ وہاں تباہ رہ کر خوف سے مرجائے گی۔

وہ تو ذریتی بھی بہت ہے۔ یہاں بھی وہ گل افشاں کے ساتھ سوتی ہے۔ میری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔“ درختان نے افسردگی

”آئیے بھیا“ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ درختان اسے دیکھ کر مسکرا آئی۔ ایک پچھکی آئی مسکرا ہب۔

”اب کیسی ہو؟“ با بر نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ درختان بولی۔

”میں ابھی یہاں سے جا کر ابو کو ٹیلی فون کروں گا۔ سوچ رہا ہوں، تمہیں واپس کر اپنی بھیج دوں۔“

”ہائے بھیا“ میری ریسچ کا کیا ہو گا۔ اتنا کام میں نے کر لیا ہے۔ میری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔“ درختان نے افسردگی

تھی۔ ایسی صورت میں جبکہ وہ انتہائی ڈراؤ نے خواب دیکھ رہی ہے، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے تھے۔ دماغ سن ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں اندر سیراچھانے لگتا تھا۔

بابر نے جلدی جلدی اس کے جانے کے انتظامات مکمل کر

مجھے ڈر ہے کہیں وہ اپنے ہوش نہ گناہ بیٹھے۔ لیکن تم اسے واپس روانہ کرو۔“

”لیکن ابو وہ اُنے کے لیے تیار نہیں ہے وہ اپنی ریسرچ ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتی۔“

تین دن وہ ہسپتال میں رہی۔ اطمینان سے رہی۔ وہاں اس کے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ کوئی ڈراؤ نا خواب نہ دکھائی دیا۔ اسے فاخرہ جا گتے میں نظر آئی، لیکن بابر نے اسے احتیاطاً ہسپتال میں ہی رکھا۔ اگرچہ ہسپتال سے دوسرے دن ہی مکمل آرام کی ہدایت کے ساتھ چھٹی مل گئی تھی، لیکن بابر نے اسے گھر لانا مناسب نہ سمجھا۔ گھر آکر خدشہ تھا کہ دیسی ہی نہ ہو جائے۔

جس دن درخشاں کی کراچی روائی تھی۔ اسی دن وہ اسے ہسپتال سے گھر لایا تاکہ وہ اپنا سامان اکٹھا کر سکے۔

”ہاں وہ ایسا ہی کہے گی۔ پڑھائی سے اسے بے حد لگاؤ ہے۔ ریسرچ ادھوری رہنے کا اسے دکھ تو ہو گا، لیکن اسے سمجھاؤ کہ وہ تنباں حالات میں وہاں کیسے رہے گی۔ تم کسی بھی طور اسے سمجھا بھجا کر روانہ کر دو۔“ ابو نے سختی سے تاکید کی۔

بابر بلاں نے گھر والوں کا فیصلہ درخشاں کو سنایا۔

درخشاں کو ناچوراں فیصلے کو قبول کرنا پڑا۔ ویسے وہ خود بھی اندر سے اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ گھر میں تنبار ہنے کے خوف سے اس کے

سامان اکھا کرتے ہوئے جب اس نے میز کی درازیں کالی کیں دب گئی تھیں اسے اب کریدنا بیکار تھا۔

تو اس کے ہاتھ ڈینی کی بھجوائی ہوئی ڈائری اور کیسٹ لگ گئے۔

”ارے درختاں! تم کہاں ہو، جلدی کرو بھی!“ میں نہانے جا رہا

ہوں۔“ با بر بلال کی آواز آئی تو وہ ایک دم چونک اٹھی۔ اس نے لپ

ایک لمح کو اس کی آنکھوں میں اندر چیر اسا چھا گیا۔ ڈینی کی یاد

نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر اسے وہ لپ اسٹک یاد آئی جو

ڈینی کا پہلا اور آخری تھی۔ وہ اس کے بیگ میں تھی۔ اس نے بیگ

درختاں جلدی اپنی چیزیں سینے گئی۔ سب سے پہلے اس

نے سوت کیس میں ڈائری اور کیسٹ کو رکھا۔ اس کے اوپر اپنے

کپڑے رکھنے لگی۔

کپڑے رکھتے رکھتے کمرے میں اسے سرراہبٹ کا سا احساس

ہوا۔ جیسے دروازے پر آ کر کوئی رک گیا ہو، درختاں نے ڈرتے

ڈرتے نظریں اوپر اٹھائیں۔

وہ کھڑی تھی۔

ایک لمح کو اس کی آنکھوں میں اندر چیر اسا چھا گیا۔ ڈینی کی یاد

نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر اسے وہ لپ اسٹک یاد آئی جو

ڈینی کا پہلا اور آخری تھی۔ وہ اس کے بیگ میں تھی۔ اس نے بیگ

لپ اسٹک نکالی اور ڈرینگ نیبل کے سامنے بینڈ کر اپنے ہونٹوں

پر لگانے لگی۔

اس کا جی چاہا کہ جانے سے پہلے پروفیسر ڈینی سے مل لے۔ اگر

مل نہیں سکتی تو کم از کم فون پر ہی بات کر لے۔ اب یہ سب کرنے کا کیا

فائدہ۔ ڈینی اپنی دنیا میں واپس چلا گیا تھا، اسے آواز دینا فضول تھا۔

ملاقات کرنے یا فون پر بات کرنے سے محض وہ زخم کھاتے جواب مند

مل ہو چکے تھے، اس کے علاوہ کوئی فائدہ نہ تھا۔ جو چنگاری را کھلتے

”بھیا، وہ پھر آئی تھی جہاں آپ کھڑے ہیں، میمیں کھڑی تھی۔ وہ

کبھر ہی تھی کہ میں تیرا پچھا نہیں چھوڑوں گی تو کراچی جا رہی ہے تو
میں بھی تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔ بھیا، یہ میرے پیچھے کیوں پڑ گئی

ہے؟“

”درخشاں تم اس سے ڈرنا چھوڑ دو اب تمہیں آئندہ دکھائی دے
تو اس کے منہ پر کوئی چیز اٹھا کر کھینچ مارو۔ پھر وہ تمہیں دکھائی نہیں دے
گی۔“ باہر نے یہ بات مخفی اس کی تسلی کے لیے کہہ دی تھی ورنہ وہ جانتا
تھا کہ فاختہ کا کوئی وجود نہیں، یہ مخفی اس کا وابھہ ہے۔

”بھیا، اتنی بہت اپنے اندر کیاں سے لا اوں میرے تو اے
دیکھتے ہی حواس متعطل ہو جاتے ہیں۔“

”ہسپتال میں تو وہ نہیں دکھائی دی؟“ باہر نے پوچھا۔

”نہیں، بالکل نہیں۔ میں تو خوش ہو رہی تھی کہ اس سے نجات مل

شعلوں میں لپٹی اور غصے میں بھری۔

”جہاں جا رہی ہے کیمنی۔ تو سمجھتی ہے کہ میں تیرا پچھا چھوڑ دوں
گی۔ چل تو کراچی چل، میں بھی تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔“

اسے دیکھ کر درخشاں نے چیخ مارنا چاہی، لیکن چیخ جیسے گھٹ کر رہ
گئی۔ کرے سے باہر نکلنے کا راستہ بند تھا۔ دروازے پر وہ کھڑی تھی۔
اس نے بڑی مشکل سے اپنے حلق سے آواز نکالی۔ وہ بھیا، بھیا، کر
کے چھینچتھی، لیکن آواز جیسے اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔ پھر اسے
چکر سا آیا اور وہ اندر نہیں منہ بیڈ پر گر پڑی۔

کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ باہر باتھ دروم نے نباکر نکل آیا
تھا۔ اس کے گنگنا نے کی آواز آرہی تھی، جب وہ یہ دیکھنے کے لیے کہ
درخشاں نے کتنی تیاری تکمیل کر لی ہے، کرے میں آیا تو یہ دیکھ کر اس
کے ہوش اڑ گئے کہ درخشاں آنکھیں پھاڑے چھپت کو گھور رہی ہے۔“

کپڑے بدل کر درختاں نے دروازہ مکھول دیا۔

بابر بلاں بھی تیار ہو چکا تھا۔ اس نے گھٹری دیکھی اور درختاں

سے پوچھا۔ ”پھر چلیں؟“

”ایک منٹ میں ذرا سر زنگ سن کو گذبانی کیہا آؤ۔“ بہت اچھی خاتون ہیں۔“

”اچھا نمیک ہے، لیکن اتنا یاد رکھو کہ وقت بہت کم ہے وہاں کافی پینے نہ بیٹھ جانا۔“ بابر نے بنتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ تو بتاؤ،“ کیا تمہاری ڈینی سے بات ہو گئی تھی؟“

”نہیں، ان سے تو نہیں ہوئی۔ میں نے ٹیلی فون پر ڈائی کیا، لیکن فون نہ مل سکا۔ البتہ ڈاکٹر براؤن سے میں نے ہسپتال سے بات کر لی تھی۔ وہ بہت پریشان تھے کہ اچانک میرا زوس بریک ڈاؤن کیسے ہو گیا اور یہ کہ اتنے لمبے عرصے کے لیے کیوں پاکستان جا رہی ہوں۔“

گئی۔ اب میں بیکار کر اچھی جا رہی ہوں، لیکن اس نے ظاہر ہو کر بتا دیا کہ ابھی اس نے میرا اچھا نہیں چھوڑا ہے۔“

”وہ تمہیں تنہائی میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ میں جیسے ہی پاتھوروم میں گیا، وہ تمہارے پاس آگئی۔“

”شاید۔“ درختاں بے یقینی سے یوں۔

”اچھا، اب تم میری نظر وہ کے سامنے رہو، میں دیکھا ہوں کہ وہ کیسے تمہارے پاس آتی ہے۔“

پھر درختاں اس کے سامنے رہی۔ وہ اپنا سامان تقریباً سمیٹ چکی تھی۔ پھر وہ اپنے دو قوں سوت کیس بند کر کے اپنا الباس تبدیل کرنے لگی۔ لباس تبدیل کرنے سے پہلے اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس نے بڑی تیزی سے لباس تبدیل کیا۔ وہ ڈرتی رہی کہ کہیں سے وہ منہوس برآمد نہ ہو جائے، لیکن وہ منہوس برآمد نہ ہوئی۔

”چلو کوئی بات نہیں، میں بعد میں تو ہمیں بتا دوں گا کہ تم ان سے ملنے کی تھیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ درختان نے یہ کہہ کر ایک سوٹ کیس اٹھانا چاہا، لیکن باہر نے منع کر دیا۔

”تم ویسے ہی ہسپتال سے آ رہی ہو، پھر اتنا مباشر کرنا ہے، لہذا مشقت سے بچو۔ باہر نے دونوں ہبوٹ کیس اٹھائے، بیگ کندھے پر رکھا اور وہ دونوں لفت میں داخل ہو گئے۔

ایسے پورٹ پہنچ کر باہر نے اپنی بہن کو گلے سے لگا کر رخصت کیا۔

”مجھے قوی امید ہے کہ پاکستان پہنچ کر تمہاری طبیعت فوراً سنبل جائے گی۔ سب سے بڑا مسئلہ تنبائی کا ہے۔ تباہیں رہو گی تو خوف کم ہو گا۔ خوف کم ہو گا تو پھر تمہیں کچھ نہیں دکھائی دے گا۔“

درختان خاموشی سے اپنے بھیا کی بات سنتی رہی اور سوچتی رہی

میں نے اس سے صرف اتنا ہی کہا کہ میری کچھ پر الہمر ہیں اگر وہ دو چار مینے میں حل ہو گئیں تو میں لوٹ آؤں گی اور نہ اپنی ریسرچ اپنے ملک میں ہی مکمل کراؤں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم مزینکسن سے ہاتھ ملا کر آؤ،“ میں جب تک سامان نیچے پہنچا آتا ہوں۔ تم اپنا بیگ اپنے ساتھ لے اواب تم ادھر مت آنا، سیدھی نیچے آنا، ٹھیک ہے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور گھر پر ایک نظر ڈالتی باہر نکل گئی۔

مزینکسن گھر پر موجود نہ تھیں، اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو گئی۔ وہ تین بار گھٹنی بجا کر واپس آگئی۔ باہر نے اتنے میں سامان نکال کر باہر کھا۔ گھر کو متفہل کیا اور درختان سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ گھر پر نہیں ہیں؟“

کہ بھیا کو اندازہ ہی نہیں کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ یہ بھی تک فاخرہ لا شعوری طور پر یہ خود کو مجرم گردانی ہے۔ ایک ہستابست گھر اس کی وجہ سے اجڑ گیا۔ خوف کو دور کرنے اور لا شعور سے اس خیال کو نکالنے کے لیے طویل نشتوں کی ضرورت ہو گی۔ یہ سب تحلیل نفسی کے ذریعے ممکن ہو چکا اور تحلیل نفسی ایک صبر آزمایا اور طویل مرحلہ ہے۔ کچھ وقت لگے گا، ایکن یہ تھیک ہو جائے گی۔

ایک روحانی معانج جو مختلف طریقہ ہائے علاج بنانے میں مشہور تھے جب انہیں درخشاں کے بارے میں بتا پا گیا اور کمل تفصیلات سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے کہا۔ ”یہ آسیب وغیرہ کا کوئی پچکر نہیں ہے۔ لڑکی بہت حساس ہے یہ کسی وہنی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ کھانے میں نمک بالکل بند کر دیں، میٹھی اشیاء بڑھا دیں۔ تیلا پانی پلانیں اور یہ میں ایک وظیفہ بتا رہا ہوں۔ سوتے وقت آہستہ آہستہ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر پڑھیں۔ انشاء اللہ لڑکی ڈرنا چھوڑ دے گی

کیا واقعی فاخرہ اس کے ذہن کی پیداوار ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ کراچی پنج کرفور آسے کئی معالجین کو دکھایا گیا۔ ان معالجوں میں روحانی معانج بھی تھے اور نفیسیاتی مرانج بھی، ایک دو جاڑ پھونک کرنے والوں کو بھی بلا لیا گیا۔

کسی کی رائے کسی سے نہ ملتی تھی۔ سب کی مختلف رائے تھی۔ نفیسیاتی معانج نے سارے واقعات من کر جواب دیا تھا۔ اسے پیش کیا وہ یہ تھی کہ اس لڑکی کے اعصاب پر خوف سوار ہے اور یہ سب خوف کے مظاہر ہیں۔ بازو پر جو لکیریں تھیں، وہ اصل میں خود درخشاں کے ناخنوں کے کھرو پچے تھے جو اس نے سوتے میں لگائے۔ فاخرہ کی موت نے اس کے اعصاب کو بہت متاثر کیا ہے۔ ایک طرح سے

فوراً ایک گلاس پانی حاضر کیا گیا۔

”گھر میں سٹیل کا گلاس نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہے۔“ جواب ملا۔

”پانی اسی میں لایئے۔ ششے کا گلاس نہیں چاہئے۔“ فوراً حکم کی تقلیل کی گئی۔

سٹیل کا گلاس لے کر اقبال بابا نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور درخشاں سے مخاطب ہو کر بولا ”اوی بی ذرا اس پانی کو پیو۔“

”بابا، کچھ ہو گا تو نہیں؟“ درخشاں گلاس لیتے ہوئے پہنچائی۔

اقبال بابا نے درخشاں کے ابوحنیف صاحب کی طرف دیکھا۔

”پی لو بیٹا، کچھ نہیں ہو گا۔ ہم جو بیباں موجود ہیں۔“ انہوں نے یقین دلایا۔ پھر حنیف صاحب نے بیباں سے گلاس لے کر اس کے منہ سے لگنا چاہا تو اقبال بابا نے گلاس فوراً پیچھے کر لیا اور بولا۔ ”آپ ہاتھ پھونک ماری اور کہا۔ ”ایک گلاس پانی۔“

اور اس کی صحت بھی بحال ہو جائے گی۔“

خاندان کی ایک خاتون ایک جھاڑ پھونک والے سے واقف تھیں۔ انہوں نے درخشاں کی امی سے ذکر کیا۔ ”ارے تم کہوتے اقبال بابا کو لاوں۔ کوئی تعویذ وغیرہ دے دیں گے تو وہ کہیں ہماری پیچی کا پیچھا چھوڑ دے گی۔“

”ٹھیک ہے خالہ، چلو ان کوئی دکھائے دیتے ہیں۔ تم لے آؤ کسی دن۔“ وہ اگلے ہی دن اسے لے آئیں۔

اقبال بابا نے درخشاں کو اپنے سامنے بٹھا کر کچھ پڑھا۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھی، خالی خالی نظر وہ اسے دیکھتی رہی۔ گھر کے تمام افراد بھی کمرے میں موجود تھے۔

کچھ پڑھنے کے بعد اقبال بابا نے دور ہی سے اس کے منہ پر پھونک ماری اور کہا۔ ”ایک گلاس پانی۔“

”اچھا بیٹا، آپ جائیں آرام کریں۔“ اس نے درختان سے کہا۔

درختان کے ساتھ ہی دوسرے بھائی بہن بھی کمرے سے نکل گئے۔ تب اقبال نے درختان کے ابو سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اس لڑکی پر اثر ہے۔ آپ کی مرحومہ بہو اب کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ مر کر چین نہیں پا سکی ہے۔ اسی دنیا میں یہیں رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں جو پیالہ ہے جب تک وہ اس لڑکی کے خون سے بھرنہیں لے گئی چین سے نہیں بیٹھے گی اور جس دن اس کا پیالہ بھر جائے گا۔ لڑکی کی صوت واقع ہو چائے گی۔

”ہائے میرے اللہ۔“ درختان کی امی اپنادل پکڑ کر رہ گئیں۔ ”بابا جی، آپ میری بچی کے لیے کچھ کریں نا۔“

”ہاں ضرور کروں گا“ میں اس بچی کو اس چڑیل سے نجات دلا کر

نہ لگا نہیں۔“ ”چلو بیٹا، گلاس لے لو۔“ اس مرتبہ امی نے کہا۔

”درختان نے ڈرتے ڈرتے اقبال بابا کے ہاتھ سے گلاس لیا اور تین گھونٹ پانی پیا۔ ”لاو، اب دے دو۔“ اقبال بابا نے گلاس میں جھانکا۔ پھر پھونک مارنی۔ دو تین مرتبہ اس نے ایسا ہی کیا۔ پھونک مار کر وہ گلاس میں جھانکتا۔ یوں محیوب ہور ہاتھا جیسے وہ گلاس میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوا۔

پھر دو تین منٹ تک گلاس میں ٹکنگی باندھ دیکھا رہا۔ اس کے بعد اس نے گبر انسانس لیا۔ درختان کو دیکھا۔ وہاں موجود تمام حاضرین پر ایک ایک کر کے نظر ڈالی اور پھر گل افشاں سے مخاطب ہو کر بولا ”بیٹا، ذرا یہ پانی کسی گملے میں ڈال دو۔“

”جی، اچھا۔“ گل افشاں نے فوراً گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

رہوں گا۔ کل آکر مجھ سے تعویز لے جائیں۔ پڑھا ہو اپنی روانی روں گا۔ تھی۔ گل افشاں اس کے ساتھ سوتی تھی۔ درختاں کی چیزوں نے اب اسے بھی خوفزدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ پلانیں۔ آج گے دیکھتے ہیں گیا ہوتا ہے۔“

اس طرح درختاں تین معاجبوں کے درمیان بچنسی ہوئی تھی، لیکن آئی تھی، شعلوں میں لپٹی اور غصے میں بھری۔ تو گل افشاں کے جسم فائدہ کسی سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی حالت روز بے روز خراب ہوتی ہیں کچھی چھوٹ جاتی تھی۔ گل افشاں، درختاں کے مقابلے میں

ادھرنیویارک میں باہر بلال اپنی بہن کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس نے فون پر مسلسل رابطہ قائم کیا ہوا تھا۔ ہر دوسرے تیسرا دن اس کا کر دی تھی۔

پھر ان دونوں کے کمرے میں اگنی بھی سونے لگیں، لیکن درختاں کا خوف کم نہ ہوا۔ فاخرہ اسی طرح پیالہ اور چاقو لیے اس کے پاس آتی رہی اور زخم ڈال کر اس کے جسم سے خون کے قطرے نکلتی رہی۔

درختاں کو نیویارک سے آئے ہوئے تین چار ماہ ہو چکے تھے۔ وہ راتوں کو اسی طرح اٹھ کر چینے لگتی تھی۔ جیسے نیویارک میں چینا کرتی

اب زخم بازو پر ہی شہ پڑتے بلکہ جسم کے کسی بھی حصے پر نمودار ہو جاتے۔ چہرے پر، کلاں پر، پیٹ پر، پیٹ پر، ناگوں پر، زخم باریک

”کیا بھیا؟ خیر تو ہے۔“

”ہاں، اپنی طرف سے تو خیریت ہے، لیکن وہ ڈینی میرا مطلب ہے، پر و فیسر ڈینی.....“

”ہاں، کیا ہوا انہیں۔“ درخشاں نے اپنا دل تھامنے ہوئے کہا۔

”بھائی، ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اتنے دنوں کے بعد تو ان میں راضی نامہ ہوا تھا، دونوں بُنگی خوشی ساتھ رورہے تھے کہ تن ہی صح اسے خون کی ایک نئے ہوئی اور، سپتال پہنچتے پہنچتے اس کا انتقال ہو گیا۔“

”ارے، یہ تو بہت یرا ہوا، آپ میری طرف سے تعزیت کر لیجئے گا۔“ درخشاں نے کہا۔

”تم خط لکھ دینا، ناکے۔ وہ اکثر تمہیں یاد کرتا رہتا ہے۔“ با بر بال نے تنبیہ کی۔

لکیر دل کی صورت ہوتے جیسے کسی نے بلیڈ چلا یا ہو۔

جب رات کو اس کی دہشتناک چیخ پورے گھر میں گونجتی تو دلوں میں خوف بٹھا جاتی۔

درخشاں کی رنگت روز بہ روز زرد ہوتی جا رہی تھی۔ وہ برسوں کی بیمار دکھائی دیتی تھی۔ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بڑی مشکل سے کچھ کھاتی تھی، وہ بھی زبردستی کھلانے پر۔ اس نے بولنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ وہ سب کے درمیان بیٹھی ہوتی، لیکن خاموش۔ گل افشاں زبردستی اس سے سوال کر کے اسے گفتگو پر مجبور کرتی۔

با بر کا ٹیلی فون آتا تو بھی بھوں ہاں کر کے ریسیور امی کو پکڑا دیتی۔ ”ای آپ بات کریں، مجھے چکر آ رہا ہے۔“

ایک دن با بر کا ٹیلی فون آیا، اس نے درخشاں کو بتایا۔ ارے درخشاں، ایک ایک افسوسناک خبر ہے۔“

”بھیا مجھ سے کچھ لکھنا نہیں جاتا، میں کوشش کروں گی لکھنے کی۔“ افشاں سے گھنٹوں ڈینی کی باتیں کرتی اور کبھی گل انشاں کے ذکر کرنے پر اجنبی بن جاتی پوچھتی۔ ”کون ڈینی؟ میں کسی ڈینی کو نہیں

اس نے مجبوری ظاہر کی۔

پھر اس نے ڈینی کو خط لکھنے کی کوشش بھی کی، لیکن ذہن نے کام نہ جانتی۔“

نیویارک سے آئے ہوئے درخشاں کو اب دس گیارہ مہینے ہو گئے کیا۔ کچھ ذہن نے کام نہیں کیا، کچھ اس کے دل نے انکار کر دیا۔

بیوی کے بارے میں اس کا تعزیت نامہ پا کر اس کے ذہن میں جانے تھے اور ان دس گیارہ مہینوں میں درخشاں کی حالت پا گلوں جیسی ہو گئی کیا آئے وہ جانے کیا سوچے۔

جو یاد میں فن ہوتی، جا رہی تھیں، انہیں پھر سے اکھاڑنا کیا۔

باہر کے فون آتے رہے۔ خط آتے رہے۔ ان سے معلوم ہوتا رہا

کہ ڈینی کی اسلام میں دلچسپی برحقی جا رہی ہے۔ اس نے قرآن

شریف کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ اردو بھی بات افادہ سیکھ رہا ہے اور

اب بولنے بھی لگا ہے۔ اس کا مشرق سے لگا و بڑھتا جا رہا ہے۔

یہ سب با تیں درخشاں سنتی یا پڑھتی تو مسکرا کر رہ جاتی۔ کبھی وہ گل

اب وہ گھر سے خاموشی سے نکل جاتی۔ ادھرا ہر چیز پھر تی۔

ایک دن وہ کافٹن والے مزار پر چل گئی۔ وہاں دو تین گھنٹے رہی اور خود

کلفشن والے مزار پر اب اس کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی، ہفتے میں

دو تین دفعوں وہ وہاں ضرور ہو جاتی تھی۔ وہاں جا کر کبھی تو وہ مزار کے سامنے خاموشی سے بیٹھ جاتی، کبھی اپنا دوپٹہ اتار کر مزار کے فرش پر جھیڑو لگانے لگتی اور کبھی سیر ہیوں پر بیٹھ جاتی۔ اب گھروالوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ خاموشی سے کہاں جاتی ہے البتہ وہ خاموشی سے اس کے چیچھے لگ جاتے اور مزار سے اسے سمجھا بھجا کرو اپس لے آتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ سارا سارا دن بھوکی پیاس کی وہاں گزار دیتا۔

اس مزار سے اسے دیکھی کیوں تھی؟ یہ بات کوئی آج تک نہ جان سکا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ امریکا جانے سے پہلے وہ جب بھی کلفشن کی سیر کو لکھتی اس مزار پر فاتحہ پڑھنے ضرور جاتی تھی۔

اور یہ بات گل انشاں کو اچھی طرح معلوم تھی۔
گل انشاں کو ڈینی کے بارے میں بھی سب کچھ معلوم تھا۔

ہی رکشائیں بیٹھ کرو اپس آگئی۔

ایک انگلی بدل لی اس میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ بڑا گبر امیک اپ کرنے لگی تھی۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانا بھی گوارانہ تھا اور اب یہ حال ہو گیا تھا کہ رات کو سوتے وقت بھی ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ جاتی اور پورا میک اپ کر کے سوتی۔ کپڑوں کے بارے میں بھی اس کا رو یہ پکھا اتی طرح کا تھا۔ اس نے زندگی پھر انہائی سوبر کپٹرے پہنے۔ اب اسے چکلے کپڑے زیادہ پسند آتے۔ گہرے رنگ میں کو بھاتے۔

گھروالے سب پریشان ہوتے کہ اس لڑکی کو کیا ہو گیا، لیکن خاموش رہتے۔ اسے من مانی کرنے دیتے۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ جو وہ کرنا چاہتی ہے اسے کرنے دیں۔ جب تک کہ اس کی حرکت ضرر رسان نہ ہو۔

پھر ایک دن بابر کا خط آیا۔ خط سے معلوم ہوا کہ پروفیسر ڈینی پاکستان آ رہے ہیں، اسلام آباد میں کوئی کانفرنس ہے، اس میں شرکت کے لیے۔ یہ کانفرنس یونیکسو کی طرف سے منعقد ہو رہی تھی۔ کانفرنس کے اختتام پر وہ کراچی آئیں گے اور گھر برہی نہشbris گے۔ وہ تو کسی ہوٹل میں نہشبرنا چاہتے تھے، لیکن بابر نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا۔ اور جب یہ خوشخبری گل افشا نے درختان کو نائی تو وہ خاموش تھی۔

ساری بات سختی رہی۔ جواب میں ایک لفظ بھی نہ بولی۔ جیسے اس نے کچھ سننا ہی نہ ہو یا سننا ہو تو کچھ میں نہ آیا ہو۔ پھر وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

جب پروفیسر ڈینی گھر آئے تو گل افشا نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر مشرق و مغرب کا امترانج موجود تھا۔ سفید شلوار سوٹ پر سفید کوٹی، سفید جوتے اور گلابی چہرہ نکلتا ہوا قد۔ گل افشا

درختان نے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ لپ اسٹک، کیسٹ اور ڈائری کے متعلق بھی نہ چھپایا تھا اور جس انداز میں درختان نے اسے سب کچھ بتایا تھا، اس سے گل افشا نے اندازہ کیا تھا کہ درختان کوڑی نے شدید اقسام کی محبت ہو گئی تھی، لیکن اس جذبے کو اس نے اندر کمپنیں دبایا تھا یا دبانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

ایک طرف محبوب سے جداً کا صدمہ دوسری طرف فاخرہ کا ظہور۔ خوف اور محبت کے صدے نے اس کے اعصاب کو تو ڈرود کر رکھ دیا۔ اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔

لپ اسٹک، کیسٹ اور ڈائری ہمیشہ اس کے بیگ میں اس کے ساتھ ہوتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اسے اس بات کا ہوش نہ رہا تھا کہ یہ چیزیں اسے کس نے دی تھیں، کہاں سے آئی تھیں۔

اسے دیکھتی رہ گئی۔

”آپ ذیلی ہیں پروفیسر ذینی؟“

گل افشاں نے انگریزی میں کہا۔

”آپ نے ٹھیک پہچانا میں ذینی ہوں۔“ پروفیسر ذینی نے اردو لاد۔

میں جواب دیا۔

”اوہ!“ اردو میں جواب سن کر گل افشاں کامنہ حیرت سے کھلا کا
کھلا رہ گیا۔

”درخشاں کہاں ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”آپ اندر آجائیے آپ کا سامان کہاں ہے؟“ گل افشاں
نے پوچھتا۔

”بس یہ ہے۔“ انہوں نے اپنے پیچھے رکھے سوت کیس کو اٹھایا
اور گل افشاں کے ساتھ اندر آگئے۔

”درخشاں گھر پر موجود نہیں تھی۔ گل افشاں کو معلوم تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہو گی۔ پروفیسر ذینی اس سے ملنے کے لیے بے قرار تھے۔ جب ان کا اصرار بڑھا تو درخشاں کے ابو نے کہا۔ ”جاوہیں“ انہیں ملا

امریکا سے آتے ہوئے کچھ باتیں تو باہر نے درخشاں کے بارے میں بتا دی تھیں۔ کچھ باتیں گل افشاں نے انہیں لکھنٹن جاتے ہوئے بتا دیں اور وہ بڑے افسوس اور بڑے حرمت سے یہ یا تیں سنتے رہے۔

مزادر کی سیرھیاں چڑھتے ہوئے پروفیسر ذینی سیرھیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

تب اچانک وہ نظر آگئی۔ وہ بڑا زرق برق لباس پہنے دنیا سے بے نیاز ایک سیرھی پر بیٹھی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر درخشاں کا سب

سے چھوٹا بھائی عدنان بیٹھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ درختان
بڑے گہرے میک اپ میں تھی۔ لوگ اس کے پاس سے ایک
دوسرے کو اشارے کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ عورتیں اسے حیرت
سے دیکھ رہی تھیں، لیکن اسے کسی کی پرواہ نہیں دیکھا کے
اپنے ہوشیوں پر سرفحی چڑھا رہی تھی۔
یہ وہی لپ اسٹک تھی جو پروفیسر ڈینی نے اسے بطور تخفہ دی تھی۔
پروفیسر ڈینی اسے نہیں پہچان سکا۔ جب گل افتاب نے درختان
کی طرف اشارہ کیا۔ ”ود رہی یا مجی۔“ تو وہ ایک لمحہ کو نیک گیا۔
پھر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے نیزابر سیڑھیوں
میں بیٹھ گیا، لیکن درختان نے کوئی توجیہ نہ دی۔ وہ پورے انہماک سے
اپنے ہونٹ رنگتی رہی۔
”میں ڈینی ہوں، تمہارا ڈینی۔ کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں۔“ ڈینی
اس مرتبہ ڈینی نے اسے آواز نہ دی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے
کیلئے۔
جواب میں درختان نے اسے اجنبیوں کی طرح دیکھا اور پھر لپ
اسٹک اور آمینہ بیگ میں ڈالا۔ کھڑی ہوئی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
”سنو۔“ ڈینی نے پکارا۔
ود رک گئی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”دیکھو،
میں مسلمان ہو گیا ہوں، اب میرا نام شاہدِ اسلام ہے۔ میں نے تمہاری
زبان سیکھ لی ہے۔ تمہاری معاشرت اپنالی ہے میں تمہارے سیارے
میں آگیا ہوں۔ تمہاری دنیا میں آگیا ہوں۔“
یہ سب سن کر درختان نے اسے خاموش نہ کیا۔ وہ اس دنیا کی مخلوق نہ ہو، کسی اور دنیا کی ہو اور پھر سیڑھیاں چڑھنے
کیلئے۔
اس مرتبہ ڈینی نے اسے آواز نہ دی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے
سے اردو میں کہا۔

”پروفیسر ڈینی، آئیے، اب واپس چلیں۔“ گل انشا نے اسے روکا۔ ڈینی رُک گیا اور درخشاں کو سیرھیاں چڑھتے دیکھنے لگا۔

